U0179. P 27-1-10

Title - TAREEKH UMMAT (Part-8).

Author - Mohd. Aslam Jairajpuri.

Publisher - Maktaba Jamia Ltd. (New Delhi)

Date - 1964.

Pages - 68.

Subject -

وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَىٰ تَنفَعُ الْمُؤْمِنِينَ

تاریخ الامت

حصہ ہشتم

تاریخ اسلام اور قرآن

مصنفہ

مولانا محمد اسلم جیراجپوری

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

تاریخ الامت

حصہ ہشتم

تاریخ اسلام اور قرآن

مولانا محمد اسلم جیراجپوری
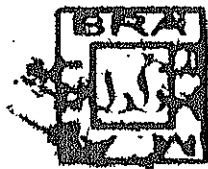
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامع دہلی

فہرست مضامین تاریخ الامّت حصہ ہشتم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

الحمدللہ وکفیٰ ۔ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ۔ امّا بعد! تاریخ الامّت کو مکمّل کیے ہوئے ایک مدّت گزر گئی ۔ اس درمیان میں بارہا یہ خواہش ہوئی کہ اس پوری تاریخ پر قرآنی زاویۂ نگاہ سے ایک تنقیدی نظر ڈالی جائے تاکہ اُمّت کو معلوم ہو جائے کہ آج جن جن مصائب و آلام میں وہ گرفتار رہے وہ اس کی کن کن غلط کاریوں اور قرآن کی مخالفتوں کے نتائج ہیں ۔ لیکن یہ سوچ کر کہ مسلمان بالعموم قرآن سے دور ہو گئے ہیں ۔ نیز اپنے ماضی کو عظمت اور تاریخی شخصیتوں کو عزّت کی نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہیں ، اور تنقید بہرصورت تلخ اور ناگوار شئے ہے ، قلم کو روک رکھا تھا ۔ مگر ساتھ ہی ضمیر کا یہ تقاضا بھی تھا کہ قرآن کو اللہ نے اسی لیے اُتارا ہے کہ اس کی روشنی میں ہم چلیں اور اپنی غلطیوں کو جانچ کر ان کی اصلاح کریں ، اس لیے اس کے طالب علم پر یہ ذمّہ داری عائدہ ہوتی ہے کہ اس کے ذریعے سے اپنی فہم کے مطابق صحیح راستہ دکھانے کی کوشش کرے اس وجہ سے بالآخر ایک فریضہ سمجھ کر اس کام کے لیے تیار ہونا ہی پڑا ۔ خاص کر ایسی حالت

میں جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ جو اُمّت کی تاریخ لکھنے کے لیے قلم اُٹھائے ہوئے ہیں، بالعموم دینی علوم میں لکیر کے فقیر اور قرآنی حقائق سے بے خبر ہیں ۔

علاوہ بریں یہ کوئی مذہبی بحث نہیں ہے جس سے کسی فریق کی تردید مقصود ہو بلکہ قرآن کی روشنی میں اپنے ماضی پر تنقید ہے جس میں جہاں تک امکان میں تھا ہم نے حق و انصاف اور اپنی مسئولیت و ذمّہ داری کو پیشِ نظر رکھا ہے اس لیے اُمید ہے کہ اربابِ بصیرت بلا کسی تعصب کے ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں گے ۔

محمّد اسلم جیراجپوری
جامعہ نگر۔ دہلی
۲ر جون ۱۹۴۴ء

تمہید

تاریخ الاُمّت کے ساتوں حصّوں میں مسلمانوں کی مرکزی تاریخ اختصار کے ساتھ بیان کردی گئی ہے، اور اس میں عہدِ رسالت سے ترکوں کے الغاء خلافت تک کے حالات آگئے ہیں۔ اس تاریخ کا عمود خلافت اسلامیہ ہے۔ یعنی سیرت کے بعد خلفاء راشدین، بنی اُمیّہ، عبّاسیۂ بغداد، عبّاسیۂ مصر، نیز فاطمیّن اور خلفاء عثمانیہ۔ دیگر مسلمان خاندان جن کی سلطنتیں مختلف ملکوں اور اقلیموں میں قائم ہوئیں ان کے تذکرے ضمناً لکھے گئے ہیں۔ کوشش یہ کی گئی ہے کہ آسان عبارت میں مختصر طریقے سے ضروری تاریخی معلومات پیش کردی جائیں تاکہ اُمت کی پوری تاریخ اور اس کی عہد بعہد کی رفتار کا ایک اجمالی نقشہ سامنے آجائے۔

اگرچہ ہر ہر دور کے خاتمے پر اس کی خصوصیات اور اس کے عروج و زوال کے اسباب سے بحث کی گئی ہے لیکن وہ تاریخی بحثیں ہیں جو مورّخ کا فریضہ تھیں۔ قرآنی روشنی میں بہت کم اشارات کیے گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کتاب کی تکمیل تک بعض قرآنی حقائق مجھ پر اچھی طرح واضح ہی نہیں ہوئے تھے اور جو سمجھ میں آسکے تھے، ان کے بیان کی جرأت میں اپنے اندر نہیں پاتا تھا۔ آج بھی میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ ان حقائق کا میں نے مکمل طور پر احاطہ کرلیا ہے بلکہ صرف اس لیے یہ تنقید لکھنے بیٹھا ہوں کہ قرآن

کے طلبہ کے لیے آیندہ کے واسطے ایک راستہ نکالوں اور بس۔

اس کی ضرورت اس لیے ہے کہ صدرِ اول یعنی صحابۂ کرام ہی کے زمانہ میں مسلمانوں میں سیاسی اختلافات پیدا ہو چکے تھے۔ اس کے بعد دینی تفریق بھی شروع ہوئی جس کی وجہ سے مختلف سیاسی اور مذہبی فرقے بن گئے اور ہر فرقہ اپنے عقائد اور خیالات کو اُمّت میں پھیلانے لگا۔ جب تاریخ کی تدوین ہونے لگی تو مورّخوں نے رطب و یابس جس قدر روایتیں پائیں جمع کر لیں۔ اہلِ غرض نے ان کو دینی تقدّس کا رنگ دے کر اپنے مقاصد میں بطور دلیل کے استعمال کرنا شروع کیا اس لیے ان تاریخوں کو عقیدت مندی کے ساتھ پڑھ لینا اور قرآن سے نہ جانچنا نہ صرف غیر مفید بلکہ بعض صورتوں میں مُضر بھی ہے۔

تاریخ کا یہ عہد جو مسلمانوں کے خیالات اور عقائد پر اثر انداز ہوا صحابۂ کرام سے بنی عبّاس کے عروج ۲۳۲ھ تک ہے۔ انھیں عباسیہ کے زمانہ میں اس کی تدوین ہوئی جس پر مختلف قسم کے عوامل کارفرما رہے۔ میں جو کچھ لکھوں گا انھیں زمانوں کے متعلق لکھوں گا۔ کیوں کہ اس کے بعد سے امّت کا مسلسل زوال شروع ہو گیا جس کی تاریخ کوئی مذہبی حیثیت نہیں رکھتی۔

اس کتاب میں جو آیتیں نقل کی گئی ہیں ان کا شمارہ اوپر دیا گیا ہے اور نیچے سورتوں کا اور کہیں کہیں صرف سورتوں کے نام لکھ دیے گئے ہیں۔

محمد اسلم جیراجپوری

جامعہ نگر۔ دہلی

۲ر جون ۱۹۴۰ء

مقدمہ

اُمّت میں جو ابتدائی اختلافات واقع ہوئے ان کی اصلی بنیاد حکومت تھی نہ کہ دین۔ جماعتوں کی باہمی نزاعوں نے بڑھتے بڑھتے جنگوں اور خونریزیوں تک نوبت پہنچائی، اور پھر ہر جماعت کے وہی سیاسی خیالات مختلف شکلوں میں ان کے دینی عقائد میں شامل ہوتے گئے، جس کے باعث الگ الگ مذہبی فرقے بن گئے۔

لہٰذا مناسب یہ ہے کہ پہلے قرآن کریم سے اسلامی نظام حکومت کو بیان کر دیں، اس کے بعد ان سیاسی اختلافات سے بحث کریں تاکہ ان کی حقیقت اچھی طرح سمجھ میں آسکے۔

اسلامی نظام

دین اسلام کی بنیاد وحدتِ اطاعت پر ہے یعنی سوائے اللہ کے کسی کی اطاعت نہیں۔ اُمّت اسلامیہ کا انفرادی اور اجتماعی مقصود حیات صرف اللہ کی رضامندی ہے، جو اسی کی اطاعت سے مل سکتا ہے لیکن اللہ خود اطاعت لینے کے لیے نہیں آتا بلکہ رسولوں کو بھیج کر ان کے ذریعے سے اطاعت لیتا ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ ۶۴/۴	اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی لیے کہ بحکم الٰہی اس کی اطاعت کی جائے۔

یہ رسول کی اطاعت عین اطاعت الٰہی ہے۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۴/۸	جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

سارے قرآن میں سوائے اللہ کی اطاعت کے کسی دوسرے کی اطاعت کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ والدین کا بھی جہاں جہاں ذکر ہے ان کے ساتھ سلوک اور احسان ہی کی وصیت ہے اطاعت کا حکم نہیں ہے۔

الغرض دینی اطاعت صرف اللہ کی ہے جس نے اپنے بندوں کی انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کی ہدایات اور ان کی عقلوں کو صحیح راہ پر لگانے اور اپنی رضامندی و نارضامندی کے عملوں کو واضح کرنے کے لیے ایک ناقابل تغیر و تبدل کتاب قرآن کریم کو اُتار دیا ہے تاکہ اس کے مطابق عمل کر کے وہ اس کی خالص بندگی کی سعادت حاصل کریں۔ اور دُنیا جہان کی اطاعت سے بے نیاز ہو جائیں۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا۔ ۱۱۴/۶	کیا اللہ کے سوا میں اور کسی کو حاکم بناؤں حالانکہ وہی تو ہے جس نے تمہاری طرف مفصل کتاب اُتار دی ہے۔

دُنیا میں جن لوگوں نے اپنے سرداروں اور بزرگوں کی اطاعت نجات کا ذریعہ سمجھ کر کی ہے وہ قیامت میں جب نتیجہ برعکس دیکھیں گے تو چل کر کہیں گے۔

رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ۶۷/۳۳	اے ہمارے رب ہم نے اپنے سرداروں اور بزرگوں کی اطاعت کی سو انھوں نے ہم کو سیدھی راہ سے گمراہ کر ڈالا۔

رسالت ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو ممتاز منصب تھے۔

۱۔ **منصب پیغمبری** ۔ یعنی پیغام الٰہی کو لوگوں کے پاس بے کم و کاست پہنچا دینا۔ اس کے امتیازات یہ ہیں ۔

(۱) اس منصب کی رو سے آپ کی تصدیق کرنا اور آپ کے اوپر ایمان لانا فرض کیا گیا۔ اور یہ امت ہمیشہ کے لیے آپ ہی کی امت ہوئی۔

(۲) یہ پیغمبری آپ کی ذات پر ختم کر دی گئی۔ اور اس کی تکمیل کے لیے آپ بھیجے ہی گئے تھے۔

(۳) اس حیثیت سے آپ کو کسی سے مشورہ لینے کا حکم نہ تھا بلکہ فریضۂ تبلیغ اللہ کی طرف سے لازم کر دیا گیا تھا۔

یٰاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۵/۶۷	اے رسول! جو تجھ پر تیرے رب کی طرف سے اتارا گیا ہے اس کو پہنچا دے اور اگر تو نے نہ کیا تو اللہ کے پیغام کی تبلیغ نہیں کی۔

۲۔ منصب امامت۔ یعنی احکام الٰہی کے مطابق لوگوں کو چلانا۔ ان کے باہمی تنازعات اور قضایا کے فیصلے کرنا۔ اجتماعی امور مثلاً جنگ و صلح وغیرہ میں ان کی قیادت اور نمائندگی وغیرہ۔ اس کے امتیازات یہ ہیں۔

(۱) یہ امامت کبریٰ جو آپ نے بحکم الٰہی بنی نوع انسان کی ہدایت و رہنمائی و صلاح و فلاح کے لیے قائم کی آپ کی ذات اور زندگی تک محدود نہیں ہے بلکہ قیامت تک مستمر ہے جو آپ کے زندہ جانشینوں کے ذریعے سے قائم رہنی چاہیئے۔

(۲) آپ کے بعد آپ کے خلفاء یعنی جانشینوں کے وہی اختیارات ہوں گے جو اس لحاظ سے آپ کے تھے۔ اور ان کی اطاعت بعینہٖ اللہ و رسول کی اطاعت ہوگی۔

(۳) اس حیثیت سے آپ لوگوں سے مشورہ لینے کے لیے مامور تھے۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۳/۱۵۹	اور امر (حکومت) میں ان سے مشورہ لیا کرو۔

اللہ و رسول

جیسا کہ مذکور ہوا قرآن میں جو احکام رسول کی اطاعت کے ہیں وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور زندگی تک محدود نہیں ہیں بلکہ منصب امامت کے لیے ہیں جس میں آپ کے بعد آنے والے جملہ خلفاء داخل ہیں۔ اور ان خلفاء کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے مرکزِ اُمّت یعنی خلیفہ یا امام کے لیے یہی لفظ یعنی "اللہ و رسول" استعمال کیا ہے۔

یاایّھا الّذین آمنوا اطیعوا اللّٰہ و رسولہ ولا تولوا عنہ وانتم تسمعون ۲۰/۸	اے مومنو! اطاعت کرو اللہ اور اس کے رسول کی اور اس سے منہ نہ موڑو جبکہ تم سن رہے ہو۔

اس آیت میں "عنہ" کی ضمیر مفرد ہے جس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اللہ و رسول دونوں سے ایک ہی شے مراد ہے یعنی مرکز۔ ورنہ قاعدے کے مطابق "عنہما" ہونا چاہیئے تھا۔ اور جبکہ تم سن رہے ہو" کی قید سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اطاعت بالمشافہ ہے۔ اور عربی زبان میں اطاعت کہتے ہی ہیں زندہ کی فرمانبرداری کو۔

یاایّھا الذین آمنوا استجیبوا اللّٰہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم ۲۴/۸	اے مومنو! اللہ و رسول کی بات مانو جب وہ تم کو ایسے کام کے لیے بلائے جس میں تمھاری زندگی ہو۔

یہاں بھی "دعا" کا صیغہ مفرد ہی اللہ و رسول دونوں کے لیے مستعمل ہوا ہے اور یہ حکم بھی حضورؐ کی زندگی تک محدود نہیں ہے بلکہ ہمیشہ کے لیے ہے جو آپ کے تمام آنے والے خلفاء پر مشتمل ہے۔

انما کان قول المومنین اذا دعوا الی اللّٰہ ورسولہ لیحکم بینہم ان یقولوا سمعنا واطعنا ۵۱/۲۴	مومنوں کا قول جب وہ اللہ و رسول کی طرف بلائے جائیں کہ ان کے درمیان فیصلہ کرے بس یہی ہے کہ ہم نے سنا اور مان لیا۔

اس میں بھی "لیحکم" جو دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے مفرد ہے۔ اسی طرح

قل اطیعوا اللّٰہ واطیعوا الرسول فان تولوا فانما علیہ ما حمل وعلیکم ما حملتم وان تطیعوہ تہتدوا ۵۴/۲۴	کہہ دے کہ اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اگر روگردانی کرو گے تو اس کی ذمہ داری اس کے اوپر ہے اور تمھاری ذمہ داری تمھارے اوپر ہے اور جو تم اس کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پر رہو گے۔

میں "علیہ" اور "تطیعوہ" دونوں میں ضمیر مفرد "اللہ و رسول" کی طرف راجع ہے۔

جنگ احد میں ہزیمت اُٹھانے کے بعد دوسرے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو حکم دیا کہ غنیم کے تعاقب میں نکلیں۔ یہ حکم چوں کہ بحیثیت امام کے تھا اس لیے قرآن میں اللہ و رسول دونوں کا حکم کہا گیا۔

الذین استجابوا للہ والرسول من بعد ما اصابہم القرح ۳/۱۷۲ | جنھوں نے حکم مانا اللہ و رسول کا اپنے زخم اُٹھانے کے بعد

اسی طرح حج اکبر کے دن مشرکوں سے برات کا اعلان جو مرکز اسلام کی طرف سے ہوا، اللہ و رسول کے نام سے ہوا۔

واذانٌ من اللہ ورسولہ الی الناس یوم الحج الاکبر ان اللہ بری من المشرکین و رسولہ ۹/۳	اور اعلان ہے اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے لوگوں کے لیے کہ اللہ اور اس کا رسول مشرکوں سے بری ہے۔

باغیوں اور ڈاکوؤں کو جو مرکز کے مجرم ہوں اللہ و رسول کا محارب قرار دیا گیا۔

انما جزاء الذین یحاربون اللہ و رسولہ ویسعون فی الارض فسادا ان یقتلوا۔ الایہ ۵/۳۳	جو لوگ اللہ و رسول سے لڑیں اور روئے زمین میں فساد پھیلائیں ان کی سزا بس یہی ہے کہ مار ڈالے جائیں۔

ان مجرموں کی یہی سزا ہمیشہ کے لیے ہے۔ کچھ آنحضرتؐ کی زندگی ہی تک محدود نہ تھی۔

نہ صرف اُن آیتوں میں جن میں اللہ و رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے بلکہ بہت سی دوسری آیتوں میں بھی اللہ و رسول سے مرکز ہی مقصود ہے۔

خمس غنیمت کے بارے میں ہے۔

انما غنمتم من شیء فان للہ خمسہ وللرسول ۸/۴۱	جو کچھ تم کو غنیمت ملے اس کا پانچواں حصہ اللہ و رسول کے لیے ہے۔

مال فیئ کا بھی حکم یہی ہے۔

ما افاء اللہ علی رسولہ من اہل القری فللہ وللرسول ۵۹/۷	بستی والوں سے جو کچھ اللہ اپنے رسول کو غنیمت دے وہ اللہ و رسول کے لیے ہے۔

ان اموال میں سے کبھی اللہ کا حصہ رسول سے جدا نہیں نکالا گیا۔ بلکہ اللہ و رسول سے

مرکزِ امّت ہی سمجھا گیا۔ اور یہ حکم رسول کے بعد بھی قائم رہا۔

الغرض قرآن کی آیات سے روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ "اللہ و رسول" کا مفہوم امّت کا مرکز یعنی خلیفہ یا امامِ وقت ہے۔ اور یہ لفظ اس کے لیے اس وجہ سے استعمال کیا گیا ہے کہ اجتماعی لحاظ سے اس کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔ جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم زندہ رہے ان کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت تھی۔ اور آپ کے بعد آپ کے زندہ جانشینوں کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔ جن کا فریضہ یہ ہے کہ منصبِ امامت کو قائم رکھیں اور اُمّت کو قرآن کے مُطابق چلائیں۔

اجتماعی نظام کی پوری شکل اس آیت میں ہے۔

یاایّہا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول و اولی الامر منکم۔ فان تنازعتم فی شیءٍ فردوہ الی اللہ والرسول ۴/۵۹	اے مومنو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور تم میں سے جو امراء ہوں ان کی اطاعت کرو اگر کسی بات میں تم جھگڑ بیٹھو تو اس کو اللہ و رسول کی طرف لوٹاؤ۔

یعنی اصل مطاع اللہ ہے اس کی اجتماعی اطاعت ہوگی رسول (مرکز) یا اس کے مقرر کیے ہوئے اور اختیار دیئے ہوئے امراء کے ذریعے سے۔ ان امراء کا کوئی حکم یا فیصلہ

---

[۱] مسلمانوں میں جب سے لامرکزیت آئی اُس وقت سے انھوں نے اللہ و رسول کی اطاعت کے لیے قرآن و حدیث کو لے لیا اور اولوالامر کی جگہ علماء آ گئے جن کے باہمی جھگڑوں میں سے کوئی ایک جھگڑا ابھی آج تک قرآن و حدیث سے فیصل نہ ہو سکا۔ یہ خیال مذہبی انفرادیت کی پیداوار ہے۔ اللہ و رسول کی اطاعت صرف زندہ امام ہی کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے جو ضروریاتِ زمانہ کے مطابق امّت کو قرآن کی روشنی میں اجتماعی مقاصد کی طرف لے چلے۔ اور اس کی ہر قسم کی باہمی نزاعوں کا فیصلہ کرتا رہے۔ نہ حدیثِ رسول ہے نہ علماء اولوالامر ہیں۔

اگر جمہور کو قرآن کے خلاف معلوم ہو تو اس میں ان کو امراء کے ساتھ منازعت کا حق حاصل ہے۔ اس قسم کے نزاعی امور میں مرکز کی طرف رجوع کرنا ہوگا جو ان کا فیصلہ کر دے گا۔

مرکز کا حکم قطعی اور آخری ہے۔ کسی مسلمان کو نہ اس سے انکار کا حق ہے نہ اس کا کہیں مرافعہ ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِينًا ۳۶/۳۳	کسی مومن مرد یا عورت کو اپنے معاملے میں اختیار باقی نہیں رہ جاتا تا جبکہ مرکز اس کا فیصلہ کر دے۔ اور جو مرکز کی نافرمانی کرے گا وہ کھلی ہوئی گمراہی میں پڑ جائے گا۔

یعنی مرکز ہی دینی اور دنیاوی امور میں آخری اور بالاترین اختیار ہے جس کی اطاعت کے سوا چارہ نہیں اور جس کی نافرمانی گمراہی ہے۔

اقوال مفسّرین

میں چوں کہ قرآن کی تشریح کا خود قرآن ہی سے قائل ہوں اس بناء پر "اللہ و رسول" کا یہ مفہوم کہ اس سے مراد مرکز ہے یعنی امام وقت ہیں نے قرآن ہی کی چند آیات سے واضح کیا ہے جو اہل بصیرت کے لیے کافی ہیں اور اگر ضرورت داعی ہوئی تو اور بھی متعدد آیات سے تفصیل پیش کرنے کی گنجائش ہے۔ مگر عام اہل اسلام قرآنی الفاظ کی تفسیر میں گزشتہ مفسّرین کے اقوال سے بھی سند چاہتے ہیں اور مدّت ہائے دراز سے اس کے خوگر ہو رہے ہیں۔ اس لیے ان کی تسکین خاطر کے واسطے چند ائمہ تفسیر کے اقوال بھی نقل کیے دیتا ہوں جنھوں نے "اللہ و رسول" کے معنی امام وقت ہی کے لکھے ہیں۔

امام ابن جریر طبری سورۂ انفال کی پہلی آیت میں۔

قل الانفال للہ والرسول ۱/۸ کہہ دے کہ مال غنیمت اللہ و رسول کا ہے۔

انفال کی تفسیر میں مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد اپنا فیصلہ یہ لکھتے ہیں :-

" انفال کے معنی کے متعلق ان اقوال میں سے قرین صواب ان لوگوں کا قول ہے۔

جنھوں نے کہا ہے کہ یہ وہ اضافے ہیں جو امام بعض یا کل فوج کے لیے کرتا ہے۔"

یہاں انفال کے معنی سے مجھے بحث نہیں۔ مدعا صرف یہ ہے کہ "اللہ و رسول" کی تفسیر انھوں نے "امام" کی ہے۔

سورۂ بقرہ میں سود خواروں سے خطاب ہے کہ اگر تم باز نہ آؤ گے۔

فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ ‎۲۷۹/۲ تو سمجھ رکھو اللہ و رسول کی طرف سے جنگ

تفسیر جامع البیان میں ہے کہ امام کا فرض ہے کہ ان سے توبہ کرائے اور نہ مانیں تو قتل کر دے۔

امام رازی نے آیت "انما جزاء الذین یحاربون اللہ و رسولہ۔ الآیہ" کے تحت میں امام ابوحنیفہ کا قول نقل کیا ہے۔

امام ابوحنیفہ نے فرمایا ہے کہ "اگر باغی یا ڈاکو نے قتل بھی کیا ہے اور مال بھی لیا ہے تو امام کو اختیار ہے کہ ان سزاؤں میں سے جو سزا چاہے اس کو دے۔"

نیز امام محی السنہ بغوی اپنی تفسیر معالم التنزیل میں لکھتے ہیں۔

"حضرت ابن عباس۔ سعید بن المسیب۔ مجاہد۔ عطاء۔ حسن بصری۔ ابراہیم نخعی۔ ضحاک اور ابو ثور نے کہا ہے کہ جس نے اسلامی محروسہ میں ہتھیار اٹھایا اور راستوں کو پرخطر کر دیا۔ پھر وہ گرفت میں آ گیا اس کے متعلق امام کو اختیار ہے" (جو سزا چاہے دے)

ان اقوال سے دو باتیں ظاہر ہو گئیں۔ ایک تو یہ کہ "اللہ و رسول" سے امام وقت مراد ہے۔ دوسری یہ کہ یہ احکام آنحضرت صلعم کی ذات یا زندگی تک محدود نہیں تھے بلکہ ہمیشہ کے لیے ہیں۔ اور یہی دونوں باتیں میں نے آیات سے واضح کی ہیں۔

آخر میں پھر تصریح کر دیتا ہوں کہ یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں مرکز کو "اللہ و رسول" کہتا ہوں بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ اجتماعی لحاظ سے مرکز ہی کی اطاعت کو قرآن اللہ و رسول کی اطاعت قرار دیتا ہے بشرطیکہ مرکز قرآن کے مطابق ہو۔

دستور العمل

قرآن جس طرح اُمّت اسلامیہ کی انفرادی زندگی کے لیے اُتارا گیا ہے، اسی طرح اس کی اجتماعی زندگی کا بھی دستور العمل وہی ہے۔ وہ ایسی کامل کتاب ہے کہ ہر زمان و مکان اور ہر ماحول میں افراد کی ہدایت اور ملّت کی رہنمائی کے لیے کافی ہے۔ اسی لیے جہاں ہر مسلمان کو ہدایت کی گئی ہے کہ قرآن کی پیروی کرے وہاں مرکز کو بھی یہی حکم دیا گیا ہے کہ اسی کے مطابق حکمرانی کرے۔

اِنَّا اَنزَلنَا اِلَیکَ الکِتَابَ بِالحَقِّ لِتَحکُمَ بَینَ النَّاسِ بِمَا اَرٰکَ اللّٰہُ ۱۰۵/۴

ہم نے تیری طرف حق کے ساتھ کتاب اتاری ہے کہ جو کچھ اللہ تجھ کو سمجھائے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلے کر۔

قرآن کے سوا کسی دوسرے قانون کی طرف رُخ کرنے کی ممانعت کی گئی۔

فَاحکُم بَینَہُم بِمَا اَنزَلَ اللّٰہُ وَلَا تَتَّبِع اَہوَاءَہُم عَمَّا جَاءَکَ مِنَ الحَقِّ ۴۸/۵

ان کے درمیان اسی کے مطابق فیصلے کر جو اللہ نے اتارا ہے اور اس حق کو جو تیرے پاس آیا ہے چھوڑ کر ان کے خیالات کے پیچھے نہ چل۔

شدید تاکید کی گئی کہ مرکز کو قرآنی تعلیمات سے ذرا بھی غفلت یا کوتاہی روا نہیں ہے اور نہایت حزم و احتیاط کے ساتھ اس پر کاربند رہنا چاہیے۔

وَاَنِ احکُم بَینَہُم بِمَا اَنزَلَ اللّٰہُ وَلَا تَتَّبِع اَہوَاءَہُم وَاحذَرہُم اَن یَّفتِنُوکَ عَن بَعضِ مَا اَنزَلَ اللّٰہُ اِلَیکَ ۴۹/۵

ان کے درمیان اسی کے مطابق فیصلے کر جو اللہ نے نازل کیا ہے اور ان کی باتوں کے پیچھے نہ جا اور احتیاط رکھ کہ اللہ کے اُتارے ہوئے کسی حکم سے ہٹا کر وہ تجھ کو فتنے میں نہ ڈال دیں۔

یہاں تک کہ یہ وعید بھی کی گئی۔

وَمَن لَّم یَحکُم بِمَا اَنزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰئِکَ ہُمُ الفَاسِقُونَ ۴۷/۵

اور جو اللہ کے نازل کیے ہوئے کے مطابق حکومت نہ کریں گے وہ فاسق ہیں۔

امام کے ساتھ مشیروں کی ایک جماعت کا ہونا قرآن کی تعلیم "وامرہم شوریٰ بینہم" کے مطابق لازم ہے اور قرآن کے حکم "شاورہم فی الامر" (ان سے حکومت میں رائے لیا کرو) کے مطابق امام مامور ہے کہ اہل شوریٰ کے مشورے سے کام کرے۔

امام اور مشیروں کی یہی جماعت امّت کی مرکزی جماعت ہے جس کا اصولی قانون صرف کتاب اللہ ہے۔ اسی کی روشنی میں ہر زمانے کی ضروریات کے مطابق قوانین بنائے جائیں گے۔ اسی کا نام حکومت الٰہی ہے جس کا مقصد اقامت حق اور اعلاکلمۃ اللہ ہے تاکہ ہر انسان صحیح طور پر اکیلے اللہ کا بندہ اور خلیفۃ فی الارض ہو سکے جس کے لیے اس کی تخلیق ہوئی ہے

فریضۂ اُمّت۔ اسلام کے معنی ہی اطاعت کے ہیں۔

اِنَّ الدِّینَ عِندَ اللّٰہِ الاسلامُ ۱۹/۳	حقیقی دین اللہ کے نزدیک اطاعت ہے

مسلمانوں کو یہی حکم دیا گیا ہے کہ وہ اللہ و رسول صلعم یعنی مرکز کے مطیع رہیں۔

واطیعوا اللہ ورسولہ ان کنتم مؤمنین ۱/۸	اگر تم ایمان رکھتے ہو تو اللہ و رسول کی اطاعت کرو

مرکز کے وفادار رہو۔ اور اس سے غدّاری اور مفوضہ فریضہ میں خیانت کاری نہ کرو۔

یاایہا الذین آمنوا لاتخونوا اللہ والرسول وتخونوا اماناتکم وانتم تعلمون ۸/۲۷	اے مومنو! مرکز سے غدّاری اور جان بوجھ کر اپنی امانتوں میں خیانت نہ کرو۔

مرکز کے احکام سے سرتابی کرنے والے سب سے زیادہ ذلیل ہوں گے۔

اِن الّذین یُحادّون اللہ ورسولہٗ اولئک فی الاذلّین ۵۸/۲۰	جو لوگ مرکز سے مخالفت کریں گے وہ ذلیل ترین لوگوں میں سے ہوں گے۔

حاصل یہ ہے کہ اسلام کے نزدیک صرف اللہ ہی حاکم ہے اور جن و انس کا فریضہ اسی کی اطاعت ہے۔ یہی نقطہ امن عالم کا مرکز ہے جس سے اقوام و اُمم کے باہمی جھگڑے اور مناقشے ختم ہو سکتے ہیں اور سب کے سب وحدتِ اطاعت کی بدولت متحد ہو سکتے ہیں۔

چوں کہ یہ مرکز عقلی ہے اس واسطے اس کے لیے محسوس مظہر کی ضرورت تھی جو منصب امامت سے پورا کیا گیا ہے۔ رسولؐ اور اس کے بعد خلفاء حکومت الٰہی کے نمائندے ہیں جو امّت سے یہ اطاعت لیں گے اور اللہ کے مقرر کیے ہوئے اصول اور احکام کے مُطابق اس کو چلائیں گے۔ یہی حکومت الٰہیہ ہے یہی اُمّت اسلامیہ کی سیاست ہے اور یہی اس کا اجتماعی دین ہے۔

حکومت۔ قرآن سوائے حکومت الٰہی کے بقیہ جملہ اقسام کی حکومتوں کو "طاغوت"[1] قرار دیتا ہے۔ بادشاہت جس کا تسلّط خلافت راشدہ کے بعد سے مسلمانوں پر ہوا، اکثر حالتوں میں دنیا کے لیے ایک مصیبت ثابت ہوتی ہے۔ کیوں کہ بادشاہ اور اس کے ارکان حکومت وزراء، امراء، عمّال اور فوج مل کر اپنی قوت سے پورے ملک کے باشندوں کو تاج کا غلام بنا لیتے ہیں اور ان کی محنت کو اس کے اور اس کے تحت میں اپنے فائدوں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

آج کل جمہوریت اور آمریّت دو قسم کی حکومتیں دنیا میں زیادہ نمایاں اور باہم دگر برسرپیکار ہیں لیکن اسلام مروّجہ اصطلاحی معنوں میں نہ جمہوریت کو صحیح قرار دیتا ہے نہ آمریّت کو۔ کیوں کہ جمہوریت میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ حق حکومت جمہور کو حاصل ہے جسے وہ اپنے نمائندوں کے سپرد کرتے ہیں۔ اس حق سے وہ نمائندے حکومت اور وضع قوانین کے مجاز ہو جاتے ہیں اور آمریت میں مختار ناطق کی ذات میں حکومت کا حق تسلیم کیا جاتا ہے۔ مگر اسلام جس کی بنیاد وحدت اطاعت پر ہے کسی انسان یا کسی انسانی

---

[1] یہ لفظ طغیان سے نکلا ہے جس کے معنی سرکشی اور حد سے آگے بڑھنے کے ہیں۔ طاغوت ہر وہ شے ہے جو اپنا تسلّط جمائے۔ خواہ مادّی تسلّط ہو جیسے بادشاہوں کا خواہ روحانی جیسے دیوتاؤں اور غلط پیشواؤں اور رہنماؤں کا۔

جماعت میں حکومت کا حق نہیں مانتا۔ بلکہ اس کو صرف اللہ کا حق قرار دیتا ہے۔

اِنِ الحکم اِلّا للہِ اَمَرَ الّا تعبُدُوا اِلّا اِیّاہُ ۴۰/۱۲	کسی کی حکومت نہیں سوائے اللہ کے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ تم سوائے اس کے کسی کی فرمانبرداری نہ کرو۔

وہی بلا شرکت غیرے حاکم اور مطاع ہے

وَلَا یُشرِکُ فی حُکمِہٖ اَحَدًا ۲۶/۱۸	اور وہ اپنی حکومت میں کسی کو ساجھی نہیں بناتا

انبیاء کرام تک کو بھی جو بنی نوع انسان کا سب سے بلند طبقہ ہے یہ حق نہیں دیا گیا کہ وہ کسی کو اپنا محکوم بنائیں۔ بلکہ صرف یہ کہ ان کو اللہ کی اُتاری ہوئی کتاب کے مطابق چلائیں۔

ما کان لبشرٍ ان یؤتیہُ اللہ الکتاب والحُکمَ والنّبوۃ ثم یقول للناسِ کُونُوا عباداً لی من دُونِ اللہِ ولکن کُونُوا ربّانیّین بما کنتم تعلمون الکتاب وبما کنتم تدرسون ۔	کسی شخص کو جسے اللہ کتاب اور حکم اور نبوت[1] دے یہ حق نہیں ہے کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے محکوم ہو۔ بلکہ (اس کو یہی کہنا فرض ہے) کہ تم اللہ والے ہو اس کے مطابق جو تم کتاب کو پڑھتے پڑھاتے ہو

اس لیے ملّت اسلامیہ کی مرکزی جماعت خود حکمران نہیں ہے بلکہ صرف قوانین الٰہی کے نفاذ کا اختیار رکھتی ہے۔ وہ ہنگامی ضروریات کے لیے جو فروعی ضوابط تیار کرے گی اس میں کوئی ایسا قانون نہیں بنا سکے گی جو قرآن سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔

وَمَن لَم یَحکُم بِمَا اَنزَلَ اللہُ فاولٰئک ھُمُ الظّٰلِمُونَ ۴۵/۵	جو اللہ کے اتارے ہوئے (اصول) کے مطابق حکومت نہ کرے وہ ظالم ہے۔

---

[1] اس آیت کا پہلا حصہ تفصیل طلب ہے۔ یہاں مختصراً اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ واوِ عاطفہ کی وجہ سے تقدیر کلام یوں ہے۔ کسی شخص کو جسے اللہ کتاب کا حامل بنائے اور کسی شخص کو جسے اللہ حق و باطل کی تمیز عطا فرمائے اور کسی شخص کو جسے اللہ نبوت بخشے یہ حق نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو اپنا محکوم بنائے۔ یعنی ایسی کوئی حکومت جس کا مقصد انسان کی اطاعت ہو قرآن کی رو سے جائز نہیں ہے۔

قرآن سے نصیحت ہر مسلمان لے سکتا ہے کیونکہ وہ افراد کی بھی مکمل اصلاح کے لیے ہے تاکہ وہ ملت کا جزو صالح بن سکیں لیکن اس کو اجتماعی طور پر عمل میں لانے کے لیے اس کی تشریح و توضیح اور اس کے اصول سے زمانے کے مقتضیات کے مطابق فروع کے اخذ کرنے کا حق صرف مرکزی جماعت ہی کو حاصل ہے۔ اسی طرح کوئی تعلیم یا تلقین یا اُمّت کی کوئی ارشاد یا رہنمائی بلا اجازت مرکز کے نہیں ہو سکے گی نیز مرکز کا یہ بھی فریضہ ہوگا کہ امّت کے افراد۔ طبقات اور جمہور و حکام کے تنازعات کو مٹاتا رہے اور ان میں باہم کسی قسم کا اختلاف و افتراق نہ پیدا ہونے دے۔ اس نظام میں ارباب علم و عقل کو فکر کی پوری حریت اور اجتہاد کی مکمل آزادی کے علاوہ قرآن نے درجات عالیہ کی سربلندی بھی عطا فرمائی ہے لیکن ان کو مطاع نہیں قرار دیا ہے اطاعت اکیلے اللہ ہی کی ہے۔ ان کی تحقیق و اجتہاد کے نتائج امّت کے لیے اسی وقت دینی یا آئینی ہوں گے، جب مرکز سے مسلّم ہو کر اس کو ملیں گے۔

قرآن کی ان تعلیمات سے جو نہایت اختصار کے ساتھ لکھی گئی ہیں حسب ذیل امور واضح ہو جاتے ہیں۔

(۱) اسلام کی بنیاد اکیلے اللہ کی اطاعت پر ہے۔

(۲) امّت سے یہ اطاعت رسول خود یا اپنے مقرر کیے ہوئے امراء کے ذریعے سے لے گا۔

(۳) رسول نام نہیں ہے بلکہ منصب ہے جس کو امامت کے لحاظ سے بذریعہ خلفاً کے ہمیشہ قائم رہنا چاہیے۔

(۴) امام کے ساتھ مشیروں کی ایک جماعت کا ہونا لازم ہے۔ یہی جماعت معہ امام کے ملت کا مرکز ہے۔

(۵) اجتماعی لحاظ سے مرکز کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔

(۶) مرکز کے اختیارات ملّت پر ہمیشہ وہی رہیں گے جو بحیثیت امام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تھے۔ اس کی اطاعت ہر مسلمان پر فرض ہے اور اس کا فیصلہ ہر امر میں آخری اور قطعی ہے جس سے کسی کو سرتابی کا اختیار نہیں ہے۔

(۷) علماء و بزرگان دین خواہ کسی درجہ کے ہوں مطاع نہیں ہیں بجز اس حد کے جس حد تک مرکز کی طرف سے ان میں سے کسی کو اختیار دیا گیا ہو۔ قرآن نے اکیلے اللہ کی اطاعت کا حکم دے کر احبار و رہبان پرستی اور پاپائیت و برہمنیّت کو ہمیشہ کے لیے فنا کر دیا ہے۔

(۸) حکومت کا حق اسلام میں سوائے اللہ کے کسی کو نہیں ہے۔ مرکز کا فریضہ صرف حکومت الٰہی کو چلانا ہے۔

(۹) اس حکومت الٰہی کا اصولی دستور العمل اللہ کی اُتاری ہوئی کتاب یعنی قرآن کریم ہے۔

(۱۰) قرآن سے نصیحت ہر شخص لے سکتا ہے لیکن اس کے اصول سے ہر زمانے میں ضوابط کی تفریع جو اُمّت کے لیے مستند آئین ہو صرف مرکزی جماعت ہی کی طرف سے ہوگی۔

عہدِ رسالت

حقیقی دین آغاز آفرینش سے ایک ہی ہے یعنی اکیلے اللہ کی بندگی۔ انسانوں کی تخلیق اسی لیے ہوئی ہے کہ اکیلے اللہ کے بندے بنیں۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ ۵۶/۵۱

اور میں نے نہیں پیدا کیا جن و انس کو مگر اسی لیے کہ میری فرمانبرداری کریں۔

اسی اطاعت الٰہی کا نام دین اسلام ہے اور قرآن نے اسی کو فطرتی دین قرار دیا ہے۔

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۳۰/۳۰

تو ایک طرف کا ہو کر اپنا رخ اصلی دین کی طرف کر یہ اس فطرت کے مطابق ہے جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بناوٹ میں کوئی تبدیلی نہیں۔ یہی سیدھا دین ہے۔

دوسری جگہ اسی مطلب کو یوں ادا کیا ہے۔

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْ آدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلٰى أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا ۱۷۲/۷

(روز ازل) جب تیرے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور خود انھیں کو ان کے اوپر گواہ بنایا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ انھوں نے کہا کہ ہاں بیشک ہم اس پر گواہ ہیں۔

خود ان کو ان کے اوپر گواہ بنانے کے معنے یہ ہیں کہ یہ بات ان کی سرشت میں رکھ دی گئی جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی کیونکہ فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں۔
رسالت کا فریضہ ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ انسانوں کی اسی صحیح فطرت کو بیدار کرے اور بھولی ہوئی شہادت ان کو یاد دلائے۔ اولینِ رسل حضرت نوحؑ یہی پیغام لے کر آئے تھے۔

یاقوم انی لکم نذیر مبین ان اعبدوا اللہ واتقوہ ۲/۷۱

اے میری قوم میں تمہارے لیے کھلا ہوا نذیر ہوں کہ تم اللہ کی فرمانبرداری کرو اور اس سے ڈرو۔

اور آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک سب کی یہی تعلیم رہی۔

شرع لکم من الدین ما وصّی بہ نوحًا والذی اوحینا الیک وما وصینا بہ ابراہیم وموسیٰ وعیسیٰ ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ ۱۳/۴۲

تمہارے لیے اس نے دین کا راستہ وہی بنایا جس کی نوح کو وصیت کی تھی اور جس کو ہم نے تجھ پر وحی کیا اور جس کی ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو وصیت کی تھی کہ دین کو قایم کرو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔

ہر اُمّت کے رسول یہی پیغام لے کر آئے۔

ولقد بعثنا فی کل امّۃٍ رسولاً ان اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت ۳۶/۱۶

اور ہم نے ہر امّت میں رسول بھیجے کہ اللہ کی فرمانبرداری کرو اور زبردستوں سے کنارہ کشی۔

کُل رسولوں کی تعلیم ایک اور امت بھی ایک ہی ہے۔

یاایہا الرسل کلوا من الطیبات واعملوا صالحا انی بما تعملون علیم وانّ ہذہ امتکم امۃ واحدۃ و انا ربکم فاتقون ۵۲/۲۳

اے رسولو! پاک روزی کھاؤ اور نیک عمل کرو تم جو کچھ کرتے ہو میں جانتا ہوں۔ یہ تمہاری امت ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا پروردگار ہوں۔ سو ڈرو مجھ سے۔

الغرض دینِ اسلام یہی ہے کہ اکیلے اللہ ہی کی فرمانبرداری ہو۔ اس کے سوا نہ کوئی

آقا ہے نہ کوئی رب ۔ نہ انسان کسی غیر کا بندہ ہے ۔

رسالت اور نبوت سلسلہ وار اپنا یہی فرض ادا کرتی چلی آئی، لیکن خاتم النبین سے پہلے جس قدر نبی یا رسول آئے وہ اپنی اپنی ایک ایک محدود جماعت کی اصلاح کے لیے تھے۔ یعنی قومی یا قبائلی نبی تھے۔ اور جہاں تک تاریخ شہادت دیتی ہے ان کے اُٹھ جانے کے بعد ان کا روشن کیا ہوا چراغ ہدایت بھی ماند پڑ جاتا یا بجھ جاتا تھا۔ یہی حال آسمانی کتابوں کا تھا کہ خود ان کے پیروان میں تغیر تبدّل اور تحریف کر کے کچھ کا کچھ بنا لیتے تھے۔

خاتم النبیین

محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے سلسلۂ نبوت ختم کرنے کے لیے اپنا سب سے آخری نبی بنایا، اور کسی قوم یا قبیلے کی طرف نہیں بلکہ ساری دُنیا کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔

قل یاایہا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعاً ۱۵۸	کہدے کہ لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں، اور ہم نے
وما ارسلنٰک الا کافۃ للناس بشیراً ونذیراً ۳۴	تجھ کو نہیں بھیجا مگر سارے انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر۔

دوسرے لفظوں میں آپ کا فریضہ یہ ہوا کہ جملہ نوع بشر کو اکیلے اللہ کی فرماں برداری میں لا کر ایک ہی آقا کا بندہ اور باہم بھائی بنانے کی کوشش کریں۔ آپ کے بعد اس فریضہ کی تکمیل آپ کی امت کے ذمّے کی گئی کیونکہ اب کوئی نیا نبی آنے والا نہ تھا۔ سورۂ حج کی آخری آیت میں ہے ۔

وجاہدوا فی اللہ حق جہادہ ہو اجتبٰکم وما جعل علیکم فی الدین من حرج ملۃ ابیکم ابراہیم ہو سمّٰکم المسلمین من قبل وفی ہٰذا لیکون الرسول شہیداً علیکم وتکونوا شہداء علی الناس	اللہ کی راہ میں کوشش کا جو حق ہے بجالاؤ۔ اس نے دین میں تمہارے اوپر کوئی تنگی نہیں کی ہے (یہ دین) تمہارے باپ ابراہیم کا ہے۔ اللہ نے تمہارا نام مسلمان رکھا پہلے سے اور اس کتاب میں بھی تاکہ رسول تمہارے اوپر تبلیغ کرے اور تم لوگوں پر تبلیغ کرو۔

اسی لیے آپ کے اوپر جو کتاب نازل ہوئی اس کو بمقابلہ دیگر آسمانی کتابوں کے دو خصوصیات عطا کی گئیں تاکہ دنیا میں اللہ کی اُتاری ہوئی مکمل تعلیم اس اُمت کے ہاتھ میں موجود رہے۔

(۱) جملہ سابقہ آسمانی کتابوں کی حقیقی اور جاودانی تعلیمات اس میں محفوظ کی گئیں اور یہ ان سب کی محافظ اور مہیمن قرار دی گئی۔

(۲) خود اس کتاب کی حفاظت ہمیشہ کے لیے اللہ نے اپنے ذمّہ لی۔

انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظوں ۹/۱۵	ہم نے ہی قرآن کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔

اس کے ایک ایک لفظ کی حفاظت کا وعدہ ہے۔

اتل ما اوحی الیک من کتاب ربک لا مبدل لکلماتہ ۲۷/۱۸	تیرے رب کی کتاب جو تیری طرف وحی کی گئی ہے اس کی تلاوت کر۔ کوئی اس کے لفظوں کو بدلنے والا نہیں۔

خاتم النبیین کا درجہ جتنا بلند رکھا گیا اتنا ہی عظیم الشان فریضہ بھی ان کے ذمہ لگایا گیا۔ پھر مشیت الٰہی نے ان کی بعثت کے لیے وہ قوم چنی جو عقیدہ و عمل میں سراسر شرک قبائلی زندگی کی سخت خوگر۔ اور آبائی رسوم پر جان دینے میں نہایت بے باک تھی۔

عرب جاہلیت

اسلام سے قبل عربی قوم سادہ طبیعی زندگی رکھتی تھی اور اپنے خاندانی رسوم و روایات کے سوا کچھ جانتی نہ تھی، صنائع سے نفور، اور علوم سے دور۔ اطراف عرب یعنی شامی سرحد کے غسانی قبائل، عراق کے اہل حیرہ اور یمن کے شہری باشندوں کو چھوڑ کر جن پر رومی اور ایرانی تہذیب کا سایہ پڑا تھا بقیہ ملک میں کہیں کہیں یہودی یا عیسائی ثقافت کے سوا تمام تر جہالت اور وحشت غالب تھی۔ نہ عرب میں کوئی مدرسہ تھا، نہ عربی میں کوئی کتاب تھی، نہ عربوں میں کوئی تعلیم یافتہ تھا۔ بلاذری نے مکہ کے صرف سترہ آدمیوں کے نام گنائے ہیں جنھوں نے اپنی تجارتی ضرورت سے معمولی نوشت و خواند حیرہ والوں سے سیکھی تھی۔ اور مدینہ کے

کل گیارہ آدمی۔

اندرون ملک میں بارش اور پیداوار کی کمی اور دائمی خشک سالی کی وجہ سے بادیہ نشینوں کا ذریعۂ معاش زیادہ تر لوٹ مار تھا۔ قبائل رات دن ایک دوسرے پر حملے کرتے تھے اور غارت گری ان کا پیشہ ہو گیا تھا جس میں کسی حد پر وہ رُکنے والے نہ تھے بقول ابن خلدون وہ دوسروں کا محل صرف اس مقصد کے لیے بھی گرانے میں دریغ نہ کرتے تھے کہ اس کی بنیاد کے پتھروں سے چولہا بنائیں گے اور دیوار کی کھونٹیوں سے خیموں کی طنابیں کسیں گے۔ اس طرح ان میں لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم تھا جس نے ان کو فنا کے قریب پہنچا دیا تھا۔

دینی لحاظ سے وہ اگرچہ اللہ کو مانتے تھے مگر مشرک اور بُت پرست تھے اور شرک تمام قبائل میں شائع تھا۔ ہر مقام اور ہر قبیلہ میں الگ الگ بت مخصوص روایات کے مطابق نصب تھے جن کی پوجا کی جاتی تھی۔ لیکن ان کے ساتھ عقیدت رسمی تھی۔ کیونکہ جاہل عربوں کی نگاہوں میں زیادہ تر مادی منفعت اور مادی زندگی تھی اور یہی ان کی ساری جہد و جہد کا محور تھی۔

تند مزاجی اور غضبناکی ان کی عام صفت تھی، چھوٹی چھوٹی باتوں پر بگڑ بیٹھتے تھے اور حریت کا جذبہ اس قدر قوی تھا کہ سوائے اپنے رئیس یا دینی اطاعت کے اور کسی کی فرماں برداری کو ننگ و عار سمجھتے تھے۔ لیکن یہ جذبہ بھی اجتماعی نہ تھا بلکہ شخصی یا قبائلی تھا اپنی یا اپنے قبیلے کی ہتک حرمت کسی طرح برداشت نہیں کر سکتے تھے اور فوراً تلوار لے کر فیصلہ کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔

الغرض عہد جاہلیت کی تہذیب اگر اس کو تہذیب کہا جا سکے جہالت۔ سفاکی اور غارت گری تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ ان مسلسل جنگوں نے ان میں شجاعت۔ جفاکشی اور خود اعتمادی پیدا کر دی تھی جس سے مشکلات میں اپنی ذات اور اپنی تلوار پر بھروسہ رکھتے

مقابل کی تعداد اور قوت کا لحاظ کیے بغیر خطرے میں کود پڑتے اور جان کی پروا نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنی ہمسایہ قوموں یعنی رومیوں اور ایرانیوں کی طرح سایہ پرورده اور تہذیب زدہ نہیں تھے۔

طبعاً ان میں سخاوت اور مہمان نوازی تھی اور وفاء عہد کو لازم سمجھتے تھے۔ اسی کے ساتھ گویائی اور قوت بیان میں ممتاز تھے۔ نیز ان کی حق گوئی۔ حق پسندی اور حق کی قبولیت کی استعداد ان کے سخت سے سخت نکتہ چینیوں کو بھی تسلیم کرنی پڑی ہے اور غالباً یہی صلاحیتیں تھیں جن کی بدولت قدرت نے انھیں اُمیوں کو خاتم النبیین کی بعثت اور ان کے بعد اسلام کا اولین مبلّغ ہونے کے لیے منتخب کیا۔

آخر کار انھیں کے گریبان سے انسانیت کا سب سے بڑا اور روشن آفتاب طلوع ہوا یعنی عرب کے مرکز مکہ مکرمہ میں ۹ ربیع الاول مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی۔

بعثت

۲۵ رمضان کو جیسا کہ بعض مؤرخوں کی تحقیق ہے غار حرا میں آنحضرتؐ پر پہلی وحی نازل ہوئی۔ یہ تاریخ مطابق تھی ۶ اگست ۶۱۰ء کے۔ اس وقت حضور اکرم کی عمر چالیس سال چھ مہینے سولہ دن کی تھی اور شمسی حساب سے ۳۹ سال ۳ ماہ اور ۱۶ دن کی۔ یہی تاریخ جاہلیت اور اسلام کی حد فاصل ہے۔ کیونکہ اسی دن خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا آغاز ہو گیا۔ جو لوگ زیادہ قرب اور خصوصیت رکھتے تھے ان میں سے چار افراد اسی دن ایمان لائے۔ عورتوں میں سے حضرت خدیجہ۔ مردوں میں سے حضرت ابو بکرؓ لڑکوں میں سے حضرت علیؓ جن کی عمر اس وقت دس سال تھی، اور غلاموں میں سے حضرت زید بن حارثہؓ جو آپ کے متبنّٰی کہے جاتے تھے۔

تین سال تک اسلام کی تبلیغ مخفی ہوتی رہی۔ آنحضرتؐ اور حضرت ابو بکرؓ اپنے

واقف کاروں میں سے جن میں حق پسندی دیکھتے ان کو اسلام کی دعوت کرتے۔ اس عرصہ میں کچھ لوگوں نے اس دین کو قبول کر لیا جنھوں نے بعد میں بڑے بڑے کارنامے چھوڑے ہیں۔ اس کے بعد جب بحکم الٰہی۔

فاصدع بما تومر واعرض عن المشرکین ۹۴ / ۱۵ | تم کو جو حکم دیا جاتا ہے اس کو کھول کر سناؤ اور مشرکوں کی پروا نہ کرو۔

دعوت اسلام کا اعلان ہوا اور شرک اور مشرکوں کی مذمت کی گئی تو کفار قریش نے مخالفت شروع کی۔

کبر علی المشرکین ما تدعوہم الیہ ۱۳ / ۴۲ | گراں ہے مشرکوں پر وہ بات جس کی طرف تو ان کو بلا رہا ہے۔

اُنھوں نے پہلے سمجھایا، پھر لالچ دلائی، پھر دھمکیاں دیں، بالآخر مقابلے پر اُتر آئے رسول اللہ پر آوازے کستے۔ بے حرمتی کرتے جو لوگ مسلمان ہو جاتے ان کے کنبہ والے ان کو ستاتے اور جو غلام اسلام قبول کر لیتا اس پر اس کا آقا سختیاں کرتا جن کی وجہ سے بعض کی جانیں بھی تلف ہو گئیں۔

پانچ سال تک ان تلخیوں اور تکلیفوں کو سہتے سہتے مجبوراً رسول اللہ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ مکہ چھوڑ کر حبشہ کے ملک میں چلے جائیں، چنانچہ رفتہ رفتہ ۸۳ مرد اور ۱۷ عورتیں مکہ سے حبشہ چلے گئے۔

بنی ہاشم اور خاص کر ابو طالب جو آنحضرت کے چچا تھے اور خاندانی لحاظ سے آپ کی حمایت کرتے تھے۔ کافروں نے ان سے بھی ہر قسم کے تعلقات توڑ لیے اور اسلام کی تبلیغ اور اس کی طرف لوگوں کے آنے میں جہاں تک ہو سکا رکاوٹ ڈالنی شروع کی۔

بعثت کے دسویں سال ابو طالب انتقال کر گئے، ان کے بعد ہی ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے بھی جو آپ کی مشیر اور مددگار تھیں وفات پائی۔ اب دشمنوں کو دست درازی کا موقع ملا اور آنحضرت صلعم کو زیادہ ستانے لگے۔ یہاں تک کہ ایک دن

ایک کافر نے خاک اٹھا کر آپ کے سر پر ڈال دی۔

اس لیے آنحضرتؐ کو اہل مکہ کے اسلام سے مایوسی ہو گئی اور اس تلاش میں ہوئے کہ کوئی ایسا قبیلہ ملے جو اسلام کی حمایت کے لیے تیار ہو جائے تو میں اس کے ساتھ مل کر تبلیغ رسالت کے فرائض ادا کروں۔ اس امید پر آس پاس کے مختلف مقامات میں تشریف لے گئے۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی۔

حج کے زمانے میں جو قبائل آتے ان میں بھی جا کر تبلیغ کرتے لیکن قریش کی مخالفت کی وجہ سے وہ بھی آپ کی طرف توجہ نہیں کرتے تھے۔ اتفاقاً مدینے کے بھی کچھ لوگ مکہ میں آئے، انھوں نے آپ کی باتیں سنیں، ان کے دلوں میں اسلام کی حقانیت بیٹھ گئی۔ واپس جا کر انھوں نے مدینے میں آپ کا چرچا کیا۔ دوسرے سال حج کے موقع پر وہاں کے بارہ آدمی آکر مسلمان ہوئے۔ آنحضرتؐ نے مصعب بن عمیرؓ کو جو سابقین اولین میں سے تھے ان کے ساتھ کر دیا کہ قرآن پڑھائیں اور مدینے میں اسلام کی تبلیغ کریں۔ اہل مدینہ پر اس تبلیغ کا ایسا اثر ہوا کہ گھر کے گھر مسلمان ہونے لگے۔

نبوّت کے تیرھویں سال وہاں کے ۷۵ مسلمان حج کے موسم میں مکّہ میں آئے۔ اور رات کے وقت چھپ کر مقام عقبہ میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کی کہ مدینے میں تشریف لے چلیں ہم جان و مال سے حمایت کے لیے تیار ہیں۔ اس بیعت کے بعد مکہ میں جو لوگ اسلام لاتے آنحضرتؐ ان کو مدینے بھیج دیتے بعد میں حبشہ کے مہاجرین بھی مدینے میں آگئے۔

ہجرت

کفار مکہ نے یہ دیکھ کر کہ آنحضرتؐ کی جماعت مدینے میں بڑھ رہی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ بھی ان میں جا ملیں اور اپنی طاقت بڑھا کر ہم سے جنگ کریں مشورہ کیا کہ قتل کر ڈالیں۔ اب اللہ نے آپ کو مکہ چھوڑ دینے کی اجازت دی۔ رات کے وقت

حضرت ابو بکرؓ کو ساتھ لے کر نکلے اور جبل ثور کے ایک غار میں چھپ رہے۔ تیسرے دن جب کفار کی تلاش و جستجو کم ہو گئی اس میں سے نکل کر مدینے کو روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر سب سے پہلے آس پاس کے یہودی قبائل سے جو دولت مند اور طاقت ور تھے عہد نامے کیے۔ منجملہ شرائط کے یہ شرط بھی تھی کہ دشمنوں کے مقابلے میں ہر ایک دوسرے کی مدد کرے گا اور یہود قریش یا ان کے حلیفوں کو پناہ نہ دیں گے۔

یہیں سے اسلام کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔ اور قرآن نے مخالفوں سے مدافعانہ جنگ کی اجازت عطا فرمائی۔

اُذِنَ للذین یقاتلون بانهم ظلموا ۳۹/۲۲	جن سے لوگ لڑتے ہیں ان کو (بھی لڑنے کی) اجازت دی گئی اس واسطے کہ ان پر ظلم ہوا۔

مدنی زندگی

مکہ سے نکل آنے کے بعد قریش کی دشمنی بڑھ گئی۔ انھوں نے نہ صرف ہجرت کر جانے والے مسلمانوں کی ملکیتوں پر قبضہ کر لیا بلکہ رؤساء مدینہ خاص کر عبداللہ بن اُبی کو جو بہت بڑا سردار تھا ان کے برخلاف اکسانا شروع کیا۔ نیز مدینہ کے آس پاس کے قبائل میں بھی ریشہ دوانیاں کرنے لگے جس سے مسلمانوں کو ہر وقت خطرہ رہنے لگا۔ آنحضرتؐ خود راتوں کو جاگتے اور جوانوں کو پہرہ دینے کے لیے مقرر کرتے۔

قریش کا ذریعۂ معاش تجارت تھا۔ ہر سال گرمیوں میں ان کا کاروان تجارت ملک شام کو جاتا تھا جس کے راستے میں مدینہ تھا۔ مسلمانوں نے سوچا کہ ان کی اس تجارت کو روک دیں تاکہ وہ عاجز آ کر امن و آشتی کا رویہ اختیار کریں۔ اس لیے جب قریش کے آنے یا جانے کا پتہ ملتا تو کبھی خود آنحضرتؐ مع صحابہ کے ان کو روکنے کے لیے جاتے اور کبھی کسی کے ساتھ کچھ آدمیوں کو بھیج دیتے۔ مورخوں نے یہ اصطلاح رکھی ہے کہ جس یورش یا لڑائی میں آنحضرت خود شریک ہوئے اس کو غزوہ اور باقی کو سریہ کہتے ہیں۔ اُنھیں

سرایا میں سے عبداللہ بن جحش کا سریہ تھا جن کو رجب ۲ھ میں آٹھ مہاجروں کے ساتھ روانہ کیا کہ مکہ کے قریب پہنچ کر قریش کے ارادے معلوم کریں۔ یہ لوگ بطن نخلہ میں تھے کہ وہاں سے عمرو بن حضرمی جو قریش کا حلیف تھا معہ اپنے تین تجارتی اونٹوں کے گزرا۔ ایک مہاجر نے اس کو تیر مارا جس سے وہ مر گیا۔ اس کے قتل سے قریش کی عداوت کی آگ اور بھڑک اٹھی، آئندہ لڑائیوں کا سلسلہ اسی سے شروع ہوا۔ چنانچہ اس واقعہ کو دو ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ بدر کی جنگ پیش آ گئی۔ ابوسفیان شام سے تجارتی قافلہ لا رہے تھے جب پتہ پایا کہ مسلمان اس پر حملہ کی تیاریاں کر رہے ہیں، تو ایک تیز رو قاصد مکہ کی طرف دوڑایا۔ قریش خبر پاتے ہی اپنے اموال کی حفاظت کے لیے روانہ ہو گئے۔ ابوسفیان راستہ بدل کر ساحل بحر سے قافلے کو نکال لے گئے اور مکہ والوں کو کہلا بھیجا کہ واپس چلو۔ لیکن قریش کے سرداروں خاص کر ابوجہل نے واپسی سے انکار کیا اور کہا کہ ہم بدر میں جا کر ٹھہریں گے اور تین دن جشن منائیں گے تاکہ قبائل میں ہمارے آنے کی شہرت اور ہمارا رعب غالب ہو جائے۔ یہ دراصل اسی انتقامی جوش و خروش کا مظاہرہ تھا۔

آنحضرتؐ مدینہ سے نکل چکے تھے۔ بالآخر مکہ والوں سے بدر میں ۱۷ رمضان ۲ھ کی صبح کو مقابلہ ہوا۔ اللہ نے بے سروسامان مسلمانوں کی جن کی کل تعداد ۳۱۳ تھی مکہ کے ایک ہزار جنگ آوروں کے مقابلے میں ایسی مدد کی کہ قریش کی طاقت جو اسلام کے سب سے بڑے دشمن تھے ٹوٹ گئی۔ ان کے ستر آدمی جن میں بڑے بڑے سردار شامل تھے، مارے گئے اور ستّر گرفتار ہو گئے۔ ان کے مقابلے میں مسلمان شہدا کی کل تعداد چودہ تھی۔

یہ جنگ درحقیقت شوکت اسلام کا سنگ بنیاد تھی جس سے ملک عرب میں بحیثیت ایک قوت کے اس کا ظہور ہو گیا۔

اس جنگ میں یہ واقعہ خاص توجہ کے قابل ہے کہ آنحضرتؐ بدر میں پہنچ کر پہلے

چشمے پر اُتر پڑے تھے۔ حضرت حباب بن منذر نے پوچھا کہ یہاں ٹھہرنے کا حکم الہامی ہے جس میں چوں وچرا کی گنجائش نہیں یا آپ نے خود جنگی تدبیر کے لحاظ سے اس مقام کو منتخب فرمایا ہے۔ جواب دیا کہ یہ خود میری رائے ہے۔ احباب نے کہا کہ یہ جگہ موزوں نہیں۔ مناسب یہ ہے کہ آگے بڑھ کر ہم قریش کی فرودگاہ کے قریب ترین چشمے پر قبضہ کرلیں اور اپنے لیے حوض بھر کر اردگرد کے چشموں کو پاٹ دیں تاکہ ان کو پانی نہ مل سکے۔ حضورؐ نے اس مشورہ کو پسند فرمایا اور اسی کے مطابق عمل کیا۔ اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ صحابۂ کرام پر آپ کی پیغمبری اور امامت کی الگ الگ حیثیتیں واضح تھیں اور بحیثیت امام کے آپ کو مشورہ دینا جائز سمجھتے تھے اور آپ بھی بطیب خاطر ان کے معقول مشورہ کو قبول فرما لیتے تھے۔

دوسرے سال قریش نے بدر کے مقتولوں کا بدلہ لینے کے لیے چڑھائی کی اور کوہ اُحد کے متصل جنگ ہوئی جس میں قریش کا پلّہ بھاری رہا۔ اس کے بعد انھوں نے غطفانی قبائل کو اپنے ساتھ ملایا اور ۵ھ میں ۲۴ ہزار کی جمعیت سے اسلام کو مٹانے کے لیے آئے۔ چوں کہ مدینے کے اردگرد کے یہودی قبائل نے بھی بدعہدی کر کے ان کا ساتھ دے دیا اس وجہ سے مسلمانوں کی حالت بہت پُرخطر ہوگئی لیکن اللہ نے مدد کی۔ دشمنوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ پھر جاڑے کے دن تھے اور تیز آندھیاں جن میں کھانا پکانا بلکہ خیموں کا سنبھالنا بھی مشکل ہوگیا۔ اور اتنی بڑی جمعیت کے لیے سامان رسد کی فراہمی۔ آخر عاجز آکر واپس چلے گئے۔

اس کے دوسرے سال صلح حدیبیہ ہوئی جس کی رو سے دس سال تک باہم امن وامان کے ساتھ رہنے کا فریقین نے عہد باندھا۔ اب مسلمان بےخطر قبائل میں جانے لگے اور اسلام کو سمجھانے اور اس کی تبلیغ کا راستہ صاف ہوگیا۔

یہ صلح اگرچہ دس سال کے لیے ہوئی تھی مگر تیسرے ہی سال قریش کے حلیف بنی بکر نے اس کے شرائط کی خلاف ورزی کی اور بنی خزاعہ کو جو رسول اللہ کے حلیف

تھے حرم تک میں قتل کیا۔ اس وجہ سے ۱۰ رمضان ۸ھ کو آنحضرتؐ نے دس ہزار صحابہ کو ساتھ لے کر قریش پر چڑھائی کی۔ یہ جنگ اپنی نوعیت میں تمام عالم میں انوکھی تھی یعنی مکہ حرم ہے۔ خونریزی بھی نہ ہو اور فتح بھی ہو جائے۔ چنانچہ سوائے ایک خفیف جھڑپ کے جس میں چند کافر ہلاک ہوئے اللہ کی مدد اور خاتم النبیین کی برکت سے مسلمان بلا جنگ کے وہاں داخل ہو گئے۔ اس فتح کے بعد اہل قریش مسلمان ہو گئے۔

نتائج

رسول اللہؐ نے جب مکہ سے ہجرت کی اس وقت تک قریش اور اس کے حلیف قبائل میں سے ایک مختصر جماعت نے اسلام کو قبول کیا تھا۔ دیگر قبائل کے صرف چند آدمی اسلام لائے تھے۔ لیکن مکی زندگی کی تیرہ سال کوششوں اور جدوجہد کا یہ اثر ضرور ہوا تھا کہ سارے عرب میں آنحضرتؐ کی رسالت کا چرچا پھیل چکا تھا۔

ہجرت کے بعد مدینے کے باشندے زیادہ تعداد میں مسلمان ہوئے جن کو انصار کا لقب ملا۔ یہاں کے لوگوں میں اسلام کا ایسا عشق تھا کہ سب مسلمان ہو جاتے لیکن رکاوٹ یہ پڑ گئی کہ ان میں سے بعض اہل اثر یا تو اسلام کی حقیقت کو نہ سمجھ سکے یا ان کو اپنی سرداری کے زوال کا خوف ہو گیا اس وجہ سے مسلمانوں کی دشمنی کرنے لگے۔ ان کے ساتھ اور بھی ان کے ہم خیال ہو گئے۔ گو اسلام کے غلبہ کی وجہ سے ظاہر میں وہ مسلمان ہو گئے تھے مگر باطن میں مخالفت کرتے تھے۔ انھیں لوگوں کو قرآن نے منافق کہا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ نرمی اور مہربانی کا برتاؤ کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ ان کا باطن بھی ظاہر کے مطابق ہو جائے۔

آنحضرتؐ عرب کے قبائل کو اسلام کی طرف بلاتے۔ ان کے پاس وفود اور خطوط بھیجتے لیکن قریش کے مغلوب ہونے سے پیشتر تک کوئی بڑا نتیجہ ظاہر نہیں ہوا۔ رسول اللہؐ کو اپنی رسالت کے فریضہ کا اس قدر خیال تھا کہ دن رات اسی

فکر میں رہتے کہ سب کو نجات کا راستہ دکھادیں اور جب لوگوں کو اس طرف آتے ہوئے نہ دیکھتے تو اپنی ذمہ داری کے احساس سے غمگین ہوتے ۔ اس پر اللہ نے عتاب کے انداز میں کہا ۔

لعلک باخع نفسک ان لایکونوا مومنین	تو شاید اس کے پیچھے جان گنوا دے گا کہ یہ ایمان نہیں لاتے ۔

پھر بار بار اس حقیقت کا اظہار کیا کہ تمہارا کام صرف تبلیغ ہے ۔ ہدایت سے لگا دینا نہیں ہے ۔ یہاں تک کہ کافروں کی ذمہ داری سے آپ کو بری کر دیا ۔ سورہ بقرہ میں ہے ۔

لاتسئل عن اصحاب الجحیم	جہنمیوں کی مسئولیت تیرے ذمہ نہیں ہے ۔

اہل عرب کے توقف کی بڑی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ اہل اسلام اور قریش میں جو لڑائیاں ہوتی تھیں وہ فیصلہ کن نہ تھیں ۔ بدر میں اگر مسلمانوں کو فتح ہوئی تو احد میں قریش غالب رہے ۔ نیز خندق کی لڑائی سے عربوں نے یہ سمجھا کہ مسلمان قریش سے رودررو مقابلے کی ہمت نہیں رکھتے ۔ اس وجہ سے اشاعت اسلام کی رفتار بہت سست تھی ۔

صلح حدیبیہ کے بعد جب کافروں سے مسلمانوں کا میل جول اور تبادلہ خیالات کا موقع ملا اور انھوں نے اس کی تعلیمات سنیں اور ان پر غور کیا تو عام طور پر ان کا رجحان اسلام کی طرف ہو گیا بلکہ خود قریش کے بعض افراد پر اس کی حقانیت اثر کر گئی ۔ چنانچہ اس صلح کے بعد ان کے دو بڑے سردار حضرت خالد بن ولید اور عمرو بن عاص مدینے میں آکر اسلام لائے ۔ کسی نے حضرت عمرو بن عاص سے پوچھا کہ اس قدر عقل و فہم رکھتے ہوئے تم نے اتنی دیر کیوں لگائی ۔ جواب دیا کہ " ہماری قوم کے رؤسا ایسے تھے جن کی عقلیں پہاڑوں سے بھی زیادہ بھاری تھیں ۔ ان کے پیچھے ہم جس راستے کو اختیار کر لیتے خواہ کتنا ہی دشوار گزار کیوں نہ ہو آسان

ہوجاتا۔ انھوں نے جب آنحضرتؐ کی نبوت کا انکار کیا تو ہم نے بھی بلا سوچے ان کی تقلید کی۔ لیکن ان کے (جنگ بدر میں مقتول ہوجانے کے) بعد جب مہمات ہمارے سروں پر آپڑیں اور ہم کو سوچنے کا موقع ملا اس وقت ہم نے دیکھا کہ معاملہ بالکل واضح ہے اور آنحضرتؐ کے رسول برحق ہونے میں کسی قسم کا شبہ نہیں ہے۔"

لیکن پھر بھی اہل عرب قریش کے منتظر رہے۔ ۸ھ میں جب مکہ فتح ہوگیا تو آنکھیں کھل گئیں اور یقین ہوگیا کہ اسلام دین برحق ہے ورنہ بیت اللہ پر اس کا تسلط ناممکن تھا۔ اسی کے ساتھ قریش جن کی مذہبی سیادت سارے عرب میں مسلم تھی اسلام میں داخل ہوگئے۔ یہ دیکھ کر عربوں نے اس دین کی طرف قدم بڑھایا اور قبائل اپنے وفود آنحضرتؐ کی خدمت میں بھیج کر اسلام میں داخل ہوگئے چنانچہ ۹ھ تاریخ میں عام الوفود کے نام سے موسوم ہوگیا۔

فتح مکہ دراصل زمانہ ماسبق و مابعد کے درمیان حد فاصل ہے۔ قریش کا اسلام لانا گویا تمام عرب میں شرک و بت پرستی کا خاتمہ تھا۔ کعبہ کے بتوں کے ٹوٹنے کے ساتھ ہی عرب کے سارے بت خاک میں مل گئے۔

اصلاح کا صرفہ

مدنی زندگی کے ان دس سالوں میں کل چھوٹے بڑے غزوات اور سرایا جو پیش آئے ان کی تعداد ۸۲ ہے۔ ان سب میں جس قدر انسانی جانیں صرف ہوئیں، ان کو بعض سیرت نگاروں نے کوشش کرکے شمار کرلیا ہے۔ فریقین کے مقتولین کی کل تعداد ۱۰۱۸ ہے۔ ۲۵۹ مسلمان اور ۷۵۹ کفار و مشرکین۔ اسی طرح کل اسیران جنگ ٦۵٦۵ تھے جن میں سے صرف ایک مسلمان[۵] بقیہ مخالفین۔ ان میں سے چھ ہزار بنی ثقیف و ہوازن کے لوگ ایک ہی جنگ حنین میں گرفتار ہوئے تھے جن کو حضور اکرمؐ نے ازراہ لطف و مہربانی دوسرے ہی دن چھوڑ دیا۔ نیز یہ بھی قطعی طور پر ثابت ہوچکا

۵؎ عمرو بن امیہ

ہے کہ ۴۸ ۲ قیدی دیگر مختلف غزوات میں بلا فدیہ رہا کیے گئے اور دو قیدی ایسے تھے جو اپنے سابقہ جرائم کی وجہ سے قتل کیے گئے۔ بقیہ ۲۱۵ جو رہ جاتے ہیں ان کی بابت ٹھیک پتہ نہیں چل سکا کہ ان میں سے کس قدر احساناً آزاد کیے گئے اور کس قدر فدیہ لے کر چھوڑے گئے۔ یہ بھی ممکن ہے ان میں سے کچھ اسلام لا کر مسلمانوں میں شامل ہو گئے ہوں۔

سوچنے کا مقام ہے کہ دنیا کا یہ سب سے بڑا عظیم الشان دینی انقلاب کس قدر قلیل نفوس کے صرفہ سے عمل میں آیا۔ مجھے ان بزرگوں پر حیرت ہوتی ہے جو سرورِ عالمؐ کے ایسے معجزانہ کارناموں میں ان کی عظمت کو نہیں دیکھتے بلکہ اس کے لیے محسوس خوارق عادات کی جستجو میں رہتے ہیں۔

تعلیم

رسالت کی غرض ہمیشہ سے تعلیمات الٰہی کی تبلیغ ہے۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی فریضہ یہی تھا۔

ہوالذی بعث فی الامیین رسولا منہم یتلوا علیہم آیاتہ ویزکیہم ویعلمہم الکتاب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین ۶۲/۲	اللہ ہی ہے جس نے ان پڑھوں میں انھیں میں سے ایک رسول کھڑا کیا جو ان کو اس کی آیتیں سناتا اور پاکیزہ بناتا اور کتاب وحکمت سکھلاتا ہے۔ ہر چند کہ وہ پہلے سے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

رسول اللہ کی تعلیم تمام تر وہی تھی جو اللہ ان کے اوپر بذریعہ وحی کے اتارتا تھا۔ اسی کی تبلیغ فرماتے اور، اسی پر عمل کر کے اپنی مثال سے ان کے اعمال و عقائد اور ظاہر و باطن کو پاکیزہ بناتے اور جہالت اور وحشت کی تاریکی سے نکال کر ایمان و عمل صالح کی روشنی میں لاتے۔

کتاب انزلناہ الیک لتخرج الناس من الظلمات	عظیم الشان کتاب جو ہم نے تیری طرف اتاری کہ

الی النور باذن ربہم ۱/۱۴ | لوگوں کو اللہ کے حکم سے تاریکی سے روشنی میں نکال لائے

یہی کتاب مجید آپ کا سرمایۂ تبلیغ و انذار تھی ۔

واُوحِیَ اِلَیَّ ہٰذا القرآنُ لِاُنذِرَکُم بِہٖ وَمَن بَلَغَ ۱۹/۶ | اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا کہ اس کے ذریعے تم کو اور جس تک یہ پہنچے اس کو آگاہ کروں ۔

قل انما انذرکم بالوحی ۴۵/۲۱ | کہدے کہ میں تو صرف وحی کے ذریعے سے آگاہ کرتا ہوں ۔

قرآن میں بیسیوں جگہ آنحضرت کو حکم دیا گیا ہے

اتبع ما یوحی الیک | اس کی پیروی کر جو وحی تیری طرف بھیجی جاتی ہے ۔

اور آپ کی زبان سے اعلان کرایا گیا ہے ۔

قل انما اتبع ما یوحی الیّ من ربی ۲۰۳/۷ | کہدے کہ میں تو بس اسی کا تابع ہوں جو مجھ پر میرے رب کی طرف سے وحی آتی ہے ۔

الغرض رسول اللہؐ اپنے قول و عمل سے قرآن ہی کے معلّم اور مبلغ تھے ۔ مورخین لکھتے ہیں کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ سے کسی نے حضور کے اخلاق کی صفت دریافت کی ۔ موصوفہ نے یہ مختصر اور حقیقی جواب دیا کہ آپ کا خلق قرآن تھا ۔

مکہ کی تیرہ سال کی زندگی میں ۹۳ سورتیں نازل ہوئیں جو قرآن کا تقریباً دو ثلث ہیں ۔ اس وقت تک چونکہ اسلام میں تھوڑے افراد داخل ہوئے تھے اور زیادہ تر خطاب کفار و مشرکین سے تھا اس وجہ سے احکامی آیتیں بہت کم نازل ہوئیں بیشتر ایمان کی ترغیبات ہیں ۔ بالخصوص توحید و معاد پر زیادہ زور ہے ۔ مختلف قسم کے دلائل سے شرک کی تردید کی گئی ہے اور بعث بعد الموت کا ثبوت دیا گیا ہے نیز اقوام سابقہ کے عبرت انگیز واقعات جا بجا دُہرائے گئے ہیں ۔

مدینہ میں آنے کے بعد اسلامی جماعت بن گئی اور حکومت الٰہی قائم ہو گئی اس لیے یہاں انفرادی تعلیمات کے ساتھ اجتماعی امور کے متعلق بھی آیات نازل ہوئیں

اور دین الٰہی قرآن میں مکمل کر دیا۔

طریق تعلیم

رسول اللہؐ کا طریقِ تعلیم سرتا سر مربیانہ تھا۔ ہر چھوٹے بڑے کے ساتھ ایسی محبت سے پیش آتے کہ سب لوگ آپ کو شفیق باپ سے بڑھ کر سمجھتے۔ جو ملنے کے لیے آتا اس کی تعظیم کرتے۔ اپنا گدّا یا کمبل اس کے لیے بچھا دیتے فقیروں اور مسکینوں کے ساتھ بیٹھتے۔ ان کی مدد کرتے اور بیمار پرسی کے لیے جاتے ہر شخص کی عزّت کا خیال رکھتے یہاں تک کہ صحابہ میں سے ہر ایک یہ سمجھتا کہ آپ مجھ سے زیادہ کسی کو نہیں چاہتے۔

قرآن کریم نے آپ کے خلق عظیم کی مدح کی ہے اور رؤف ورحیم کا خطاب دیا ہے۔ آپ بدخواہوں اور دشمنوں کے ساتھ بھی مہربانی کا برتاؤ کرتے اور ہمیشہ عفوو درگزر سے کام لیتے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور اکرمؐ نے کبھی کسی سے اپنی ذات کے بارے میں بدلا نہیں لیا، ہاں کوئی دین کی ہتک حرمت کرتا تو اس کو سزا دیتے۔

انجام کار اہل عرب ہر قسم کی دشمنی اور مخالفت کے بعد آپ کی طرف جھکے اور آپ کی ذات کو مجسّم صداقت اور انسانیت کا مکمل نمونہ پاکر اپنا دینی اور دنیادی مرکز بنا لیا اور ان کی نگاہوں میں اللہ کی اطاعت کے سوا کوئی مقصد نہ رہا۔ تائیدِ الٰہی نے ان کے دلوں سے قبائلی عداوتیں اور پشتہا پشت کے کینے نکال کر ان کو باہم متحد اور اخوت دینی کے رشتہ میں منسلک کر دیا۔

لو انفقت ما فی الارض جمیعاً ما الّفت بین قلوبھم ولکن اللہ الّف بینھم ۸/۶۳	اگر تو دنیا کی ساری دولت بھی خرچ کر ڈالتا تو ان کے دلوں کو نہ جوڑ سکتا اللہ نے ان کو جوڑ دیا۔

اس تالیف کا بڑا ذریعہ آنحضرت صلعم کی رافت و رحمت اور مربیانہ تعلیم تھی۔

ولو کنت فظاً غلیظ القلب لانفضوا من حولک ۱۵۹/۳ | اگر تو سخت اور سنگدل ہوتا تو تیرے پاس سے لوگ منتشر ہو جاتے۔

طبقات صحابہ

یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ سارے اہل عرب کے دلوں میں اسلام راسخ ہو گیا تھا۔ کیوں کہ ان میں سے بعض بدوی قبائل نئے نئے مسلمان ہوئے تھے جن کے اندر جاہلیت کی عادتیں باقی تھیں۔ ان کا ذکر خود قرآن میں کئی جگہ ہے۔ بے شک شہری باشندوں میں اسلام کا اثر صادق تھا انھیں میں سے صحابہ کبار اور رؤسا اسلام ہوئے۔

قرآن نے مہاجرین و انصار میں سے سابقین اولین کا درجہ سب سے بلند رکھا ہے۔

والسابقون الاولون من المہاجرین والانصار والذین اتبعوہم باحسان رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ ۱۰۰/۹	مہاجرین وانصار میں سے سابقین اولین اور جن لوگوں نے خلوص کے ساتھ ان کی پیروی کی ان سے اللہ راضی ہے اور وہ بھی اللہ سے راضی ہیں۔

پھر اس نے زمانے کے لحاظ سے صحابہ کے دو درجے کیے ہیں۔

لا یستوی منکم من انفق من قبل الفتح وقاتل اولئک اعظم درجۃً من الذین انفقوا من بعد وقاتلوا ۱۰/۵۷	تم میں سے جن لوگوں نے فتح مکہ سے پہلے خرچ کیا اور لڑے وہ برابر نہیں ہیں ان کا درجہ ان لوگوں سے بڑا ہے جنھوں نے بعد میں خرچ کیا اور لڑے۔

بعض مورخوں نے ان کے طبقات کے مراتب بارہ تک پہنچائے ہیں جن میں آخری وہ طبقہ ہے جو فتح مکہ کے بعد اسلام لایا۔

بہر صورت مجموعی حیثیت سے حضور نے اپنی تعلیم و کوشش اور اللہ کی تائید سے انھیں امیوں اور بدویوں سے ایسی امت تیار کی جو انسانی صفات میں ایسے بلند مرتبہ پر پہنچ گئی کہ اس نے نہ صرف قیصریت اور کسرویت کے بتوں کو توڑ کر حکومت

الٰہی قائم کردی بلکہ ان کی قدیمی تہذیبوں کو مٹا کر ان کی دینی اور دنیاوی قیادت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اور اعلاء کلمۂ حق میں وہ عظیم الشان کارنامہ چھوڑا جو عالم کی تاریخ میں بے نظیر ہے۔ قرآن نے ان کی شان میں فرمایا۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس	تم ان سب امتوں سے بہتر ہو جو انسانوں کی ہدایت کے لیے تیار کی گئی۔

الغرض خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تمام سابقہ نبیوں اور رسولوں سے زیادہ رسالت کے فریضہ پورا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ آپ نے ایسی کتاب چھوڑی جو برخلاف جملہ آسمانی کتب کے قیامت تک کے لیے محفوظ ہے۔ اور کوئی طاقت اس میں ایک حرف کا بھی تغیّر و تبدل نہیں کر سکتی۔ اور ایسی جماعت چھوڑی جو حکومت الٰہی کی علمبردار تھی اور جس نے طاغوتی طاقتوں کو توڑ کر رکھ دیا۔ پھر کعبہ کو جو شرک کا مخزن بنا دیا گیا تھا۔ بتوں اور مشرکوں سے پاک کر کے اکیلے اللہ کی عبادت کے لیے مخصوص کیا اور اس کو نئے سرے سے عالم کے جملہ موحدوں کا مرکز بنایا۔ یہاں تک کہ زمین و آسمان کی فضا میں اس سرے سے اُس سرے تک ہر دن رات میں پانچ وقت اشہد ان لا الٰہ الا اللہ و اشہد انّ محمداً رسول اللہ کی صدا گونجنے لگی۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

خلافت راشدہ

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے جن کے دلوں کو ایمان کے نور نے منور کر دیا تھا۔ اور جن کی بصیرتوں کے سامنے سے پردے اُٹھ چکے تھے قرآنی ہدایت کو سمجھا اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح حکومت الٰہی قائم کی اور جس طریق سے چلایا اس کو دیکھا اور یہ حقیقت بلا ریب و شک ان کے اوپر واضح ہوگئی کہ اسلام کا اصل مقصد یہی ہے کہ سوائے اللہ کے کوئی دوسرا حاکم و مطاع نہ ہو اور اسی کی اطاعت کی جائے۔ چنانچہ جب رسول اللہ علیہ وسلم نے انتقال فرمایا تجہیز و تکفین سے پہلے انصار و مہاجرین سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے اور کچھ ردوکد اور سوال و جواب کے بعد بالاتفاق حضرت ابوبکر رضی کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور ان کو خلیفۂ رسول اور امت کا مرکز تسلیم کر لیا۔ دوسرے دن مسجد نبوی میں بیعت عامہ ہوئی جس کے بعد حضرت ابوبکر رضی نے ایک مختصر تقریر کی۔ اس میں فرمایا:-

لوگو! قسم ہے اللہ کی نہ میں امارت کا کبھی خواہاں تھا نہ اس کی مجھ کو خواہش تھی۔ نہ میں نے کبھی پنہاں یا آشکارا اس کے لیے دعا کی لیکن مجھے خوف ہوا کہ کوئی فتنہ نہ برپا ہو جائے اس لیے اس بوجھ کو اُٹھانے کے لیے تیار ہو گیا۔ ورنہ امارت میں کوئی راحت نہیں بلکہ یہ ایک ایسا بار مجھ پر ڈالا گیا ہے جس کے برداشت کی طاقت میں اپنے اندر نہیں پاتا اور بلا امداد الٰہی اس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔

مجھے تم نے اپنا امیر بنایا ہے حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر ٹھیک کام کروں تو مدد دو اور اگر غلطی کروں تو اصلاح کرو۔ جب تک میں اللہ و

رسول کے فرمان پر چلوں تم میری اطاعت کرو، اور ان کے خلاف چلوں تو میرا ساتھ چھوڑ دو۔

اس تقریر کا ایک ایک لفظ قرآنی تعلیم اور اسوۂ رسولؐ کے عین مطابق ہے۔ خلافت کسی کا مخصوص حق نہیں ہے۔ نہ وہ کوئی راحت یا دنیا وی نفع کی چیز ہے بلکہ اللہ و رسول کی نمائندگی کی ذمہ داری کا سب سے بڑا بوجھ ہے۔ خلیفہ اگر کام ٹھیک کرے تو امت کا فریضہ ہے کہ اُس کی اطاعت اور امداد کرے۔ اگر اس سے غلطی ہو جائے تو راہ راست پر لائے۔ جو کوئی خلیفہ ہو جانے کے بعد اللہ و رسول کے فرمان سے منحرف ہو جائے اس کو اپنی اطاعت لینے کا حق نہیں ہے اس لیے ایسے وقت میں امت کو اس کا ساتھ چھوڑ کرے دوسرے کو خلیفہ بنا لینا چاہیئے۔

یہ ہے مرکز ملّت یعنی خلیفہ یا امام کی حقیقی حیثیت کہ اُمت حکومت الٰہی کے اجرار و نفاذ کے لیے اس کو منتخب کرتی ہے۔ اور اس کے ہاتھ پر بیعت کر کے اطاعت اور اشتراک عمل کا عہد باندھتی ہے۔ اگر اس میں امام کی طرف سے کوتاہی ہو تو امت کا فرض ہے کہ اس کی اصلاح کرے اور اگر اصلاح سے مایوسی ہو جائے تو معزول کر دے۔

پہلا انتخاب

قرآن کریم استحقاق خلافت نیز انتخاب کی نوعیت وغیرہ کی تعلیم سے خاموش ہے۔ جس کا مطلب اصولاً یہ ہے کہ یہ امور انسانی عقل کے سپرد ہیں کہ حالات و ظروف کی مناسبت اور موقع کے لحاظ سے ان کو سرانجام دے لے۔

حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب پہلا انتخاب تھا جس میں اُمت کے بہترین افراد شریک تھے۔ انھوں نے جو طریقہ اختیار کیا اس سے خلافت کے بہت سے مسائل میں ہدایات ملتی ہیں۔

(۱) ان کے طرز عمل سے واضح ہو گیا کہ انتخاب خلیفہ یعنی نصب امامت امّت کا

فریضہ ہے۔ امام منصوص کا کوئی شائبہ خیال یا ذکر صراحتاً یا کنایتہً اس موقع پر نہ تھا۔
(۲) یہ انتخاب جمہور کے شورے سے عمل میں آیا۔ یعنی بیعت بعد مشورہ اور اتفاق رائے سے ہوئی۔

یہ دونوں اصول نہایت واضح اور عقل کے مطابق ہیں جن میں نہ کوئی پیچیدگی ہے نہ بحث کی گنجائش۔ بے شک عمل کی شکلیں مختلف ہو سکتی ہیں لیکن وہ فروعی ہیں۔

حق خلافت

صحابہ کے خلافت کو جمہوری قرار دینے سے یہ قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ آنحضرتؐ نے اس کو کسی قبیلے یا خاندان کے ساتھ مخصوص نہیں کیا بلکہ امت کا ہر فرد اس میں برابر کا حق دار ہے۔ چنانچہ اس مجمع میں انصار خود اپنے میں سے سعد بن عبادہؓ کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے جو "الائمۃ من قریش"[1] فرمایا اس کی تخصیص کا سبب بھی ساتھ ہی بیان کر دیا کہ اگر انصار میں سے قبیلۂ اوس کا کوئی خلیفہ ہوگا تو خزرج رشک کریں گے اور خزرج کا ہوگا تو اوس۔ اور اہل عرب بجز قریش کے کسی کی خلافت کو تسلیم نہیں کریں گے۔ ان کے اس قول کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ خلافت قریش کے ساتھ مخصوص ہے بلکہ صرف یہ کہ اس وقت قریش کی عظمت عرب کے دلوں میں ہے اس لیے ان کی ذہنیت کے لحاظ سے اسی قبیلہ کے کسی فرد کا خلیفہ ہونا زیادہ مناسب ہے۔ ظاہر ہے کہ اس

---

[1] یہ حضرت ابوبکرؓ کا قول تھا جیسا کہ خود ان کی توجیہ سے ظاہر ہے۔ بعد میں ارباب غرض نے اپنے فائدے کے لیے اس کو آنحضرتؐ کی حدیث بنا لیا اور یہ نہ سوچا کہ اللہ نے تو تمام مسلمانوں کو بھائی بھائی قرار دیا ہے جن کے حقوق میں کوئی تفریق نہیں ہوتی پھر اس کا رسول کیسے خلافت کو صرف ایک اور وہ بھی اپنے قبیلے کے ساتھ مخصوص کر سکتا ہے۔ چنانچہ حضور اکرمؐ سے اس کے خلاف دوسری حدیث مروی ہے کہ تمہارے اوپر کوئی حبشی غلام بھی اگر امیر بنا دیا جائے تو اس کی اطاعت کرو۔

قسم کی ہنگامی مصلحتوں کا لحاظ تو خلیفہ کے انتخاب میں ہمیشہ رکھنا ہی ہوگا۔

الغرض مدارِ انتخاب صرف اہلیت وصلاحیت ہے اور یہ بھی سادہ اصول ہے۔ اسی کے مطابق حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب عمل میں آیا، کیونکہ تمام صحابہ میں حسب ذیل خصوصیاتؓ ان کو حاصل تھیں۔

۱۔ ابتدا ہی سے وہ آنحضرتؐ کے دوست اور مصاحب تھے اور جب حضور اکرمؐ کی بعثت ہوئی تو سب سے پہلے جو عاقل بالغ آزاد مرد اسلام لایا وہ یہی تھے۔

۲۔ اشاعت اسلام میں انھوں نے آنحضرتؐ کی عظیم الشان امداد کی اس وقت جبکہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا مددگار نہ تھا۔ اکثر سابقین اولین مثلاً حضرت عثمان بن عفان زبیر بن العوام۔ عبدالرحمٰن بن عوف۔ سعد بن وقاص۔ طلحہ بن عبید اللہ۔ ابوعبیدہ بن الجراح اور سعید بن زید وغیرہ جن کے تاریخ اسلام میں بڑے بڑے کارنامے ہیں۔ انھیں کے اثر سے اسلام لائے تھے۔ اس وجہ سے ان کے خلوص اور اسلامی خدمات کا نقش ہر دل پر تھا۔

۳۔ دین کی حمایت۔ اللہ کی رضاجوئی اور نبی کی امداد میں اپنا تقریباً سارا مال واثاثہ صرف کر دیا۔

۴۔ ہجرت میں بھی اکیلے رفیق راہ تھے اور راس کی ساری خدمات انھیں کے حصّہ میں آئیں۔

۵۔ جملہ مشاہد میں آنحضرتؐ کے ہمرکاب رہے۔ کسی میں ساتھ نہیں چھوڑا جنگ تبوک میں صاحب علم اور حج اکبر میں امیر الحاج تھے۔

۶۔ حضور اکرمؐ کے قلب مبارک میں آخری دم تک عزّت کے ساتھ ان کا اعتماد قائم رہا اور مرض الموت میں انھیں کو اپنی جگہ نماز پڑھانے کا حکم دیا۔

ان تمام وجوہ سے جماعت صحابہ میں ان کو نمایاں امتیاز حاصل تھا۔ اور سب کو

ان کے تقوے ۔ دانائی ، حلم اور صدق عزیمت پر ایسا بھروسہ تھا کہ کوئی دوسرا ان کا حریف نہیں ہو سکتا تھا ۔ چنانچہ سقیفہ بنی ساعدہ میں انھوں نے خود لوگوں سے فرمایا کہ یہ عمر اور ابو عبیدہ موجود ہیں ان میں سے کسی کو خلیفہ بنا لو تو ان دونوں حضرات نے یہ کہہ کر کہ ایسا کون ہے جو آپ کے اوپر مقدم ہو سکے ۔ انھیں کے ہاتھ پر بیعت کی ۔

انتخاب کی نوعیتیں

حضرت عمر فرمایا کرتے تھے کہ " ابو بکر کی بیعت فوری ہوئی جس کے شر سے اللہ نے بچا لیا " لیکن سوا اس کے چارۂ کار ہی کیا تھا ۔ آنحضرت ؐ کی موجودگی میں یہ مسئلہ اٹھایا نہیں جا سکتا تھا اور آپ کے بعد اگر فوراً بیعت نہ ہوتی تو فتنہ برپا ہو جانے کا اندیشہ تھا اس لیے جو کچھ ہونا تھا لامحالہ عجلت میں ہوا مگر اصول کے مطابق ہوا ۔ آئندہ کے لیے امت اس کے انسداد کی صورتیں نکال سکتی ہے ۔ مثلاً خلیفہ کے بعد عارضی انتظام کر کے امیدوار کا انتخاب سوچ سمجھ کر کیا جائے ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خلیفہ کے عمل کی مدت معین کر دی جائے ۔ جس کے اختتام پر امت اطمینان سے رائے زنی کرے کیونکہ کوئی نص ایسی نہیں ہے کہ خلیفہ مدت العمر کے لیے ہوا کرے ۔

حضرت ابو بکر کے بعد حضرت عمر کے انتخاب کی ایک دوسری شکل ہوئی ۔ جب صدیق اکبر کو اپنی موت کا احساس ہوا اس وقت امت کی مصلحت کے خیال سے ان کی یہ رائے ہوئی کہ کسی کو خلیفہ متعین کر دیں ۔ حضرت عمر کی ذات میں ان کو ایک عظیم الشان خلیفہ کی صلاحیت نظر آتی تھی اس وجہ سے ارباب شوریٰ سے رائے لے کر ان کو اپنے بعد خلافت کے لیے نامزد کر دیا ۔ یہ دوسرا طریقہ تھا خلیفہ کے انتخاب کا لیکن اس میں بھی شوریٰ جو جمہوریت کی اصل روح ہے ملحوظ تھا ۔

خلیفہ ثالث کے انتخاب میں تیسرا طریقہ اختیار کیا گیا ۔ یعنی حضرت عمر نے اپنی موت سے پہلے بڑے بڑے چھ صحابہ کو جو امت میں سب سے ممتاز اور ان کی رائے میں

خلافت کی اہلیت رکھتے تھے نامزد کیا اور حکم دیا کہ میرے بعد یہ لوگ جمع ہو کر تین دن کے اندر اندر اپنے میں سے ایک کو خلیفہ بنالیں۔ یہ طریقہ بھی تقریباً دوسرے طریقے کی طرح ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ دوسرے میں ایک شخص معین تھا اور اس میں محدود افراد میں سے ایک شخص غیر معیّن۔

حضرت علیؓ کے انتخاب کے موقع پر مدینے میں قدرتاً ان لوگوں کا غلبہ ہو گیا تھا جنھوں نے خلیفہ ثالث کو قتل کیا تھا۔ ان کی نگاہوں میں حضرت علیؓ سے زیادہ کوئی شخص خلافت کا مستحق نہ تھا۔ چنانچہ پہلے انھیں لوگوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی پھر دوسروں نے حضرت طلحہ اور زبیر کی گردنوں پر تلوار رکھ کر بیعت کرائی گئی۔ بڑے بڑے صحابہ حضرت عثمان کے ناجائز قتل اور بیعت میں جبر دیکھ کر اس سے کنارہ کش ہو گئے۔ سعد بن وقاص نے اپنا دروازہ بند کر لیا۔ عبداللہ بن عمر نے کہا کہ جب تک سب لوگ بیعت نہیں کرلیں گے۔ میں نہیں کروں گا۔ رؤسائے انصار میں سے حسّان بن ثابت۔ کعب بن مالک۔ مسلمہ بن مخلد۔ ابوسعید خدری۔ محمد بن مسلمہ، نعمان بن بشیر۔ زید بن ثابت۔ نضالہ بن عبید اور کعب بن عجرہ نے بیعت نہیں کی۔ دیگر مشاہیر میں سے حضرت مغیرہ بن شعبہ۔ عبداللہ بن سلام اور قدامہ بن مظعون بھی شریک نہیں ہوئے۔ کچھ لوگ اس خیال سے کہ ان کو بیعت نہ کرنی پڑے مدینے سے شام کی طرف چلے گئے۔ امرار ولایات نے بھی بیعت نہیں کی، اس لیے حضرت علی کا انتخاب نہ آزاد جمہوری انتخاب تھا اور نہ مکمل ہو سکا، کیونکہ اس وقت کی دنیائے اسلام کے ایک بڑے حصہ ملک شام نے ان کی خلافت تسلیم نہیں کی۔ مگر باوجود اس کے لوگوں نے بالعموم ان کو خلفار راشدین ہی میں شمار کیا کیونکہ ان کی نگاہوں میں طریق انتخاب کوئی بڑی چیز نہیں تھی۔ اگر اصل مقصد یعنی حکومت الٰہی حاصل ہو جائے اور یہ بات حضرت علی کی خلافت میں تھی۔

مرکزیت دینی

رسول اللہؐ کے بعد ان چاروں خلفاء کا زمانہ حکومت الٰہی کا زمانہ ہے جس میں اعتقاداً و عملاً دین کا اصلی مقصود یعنی اکیلے اللہ کی فرمانبرداری امت کے پیش نظر رہا۔ ان خلفاء کرام کی ذات میں تمام امت کی دینی اور سیاسی مرکزیت تھی اور جملہ اجتماعی امور میں ان کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت تھی اور ان کا حکم آخری حکم تھا۔

حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں سب سے پہلا مسئلہ جیش اسامہ کا پیش آیا جس کو رسول اللہؐ نے رومیوں اور غسانیوں کے مقابلے کے لیے تیار کیا تھا لیکن حضور کی بیماری کی وجہ سے رک گیا تھا۔ وفاتِ نبوی کے بعد جب قبائل عرب کے ارتداد کی خبریں آنی شروع ہوئیں اس وقت لوگوں نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ اب جبکہ نومسلم قبیلے مرتد ہوتے چلے جا رہے ہیں اور مخالفت بڑھ رہی ہے یہ فوج باہر نہ بھیجی جائے۔ انھوں نے نہایت سختی سے انکار کیا اور فرمایا کہ آنحضرتؐ نے اس کے بھیجنے کا حکم دے دیا تھا اور انتقال سے پہلے بار بار زبان مبارک سے تاکید فرماتے رہتے تھے۔ بڑے بڑے صحابہ نے ہرچند اصرار کیا کہ اس لشکر میں مسلمانوں کے منتخب اشخاص ہیں اور قبائل عرب کی حالت نظر کے سامنے ہے۔ ایسی صورت میں جمعیت کو متفرق کرنا مناسب نہیں ہے۔ لیکن انھوں نے فرمایا:-

> "قسم ہے اللہ کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ گر میں یہ بھی جان لوں کہ درندے مجھ کو پھاڑ کھائیں گے۔ تب بھی اس لشکر کو روانہ کروں گا۔ اور خواہ بستیوں میں میرے سوا کوئی رہ نہ جائے پھر بھی اس کو بھیجے بغیر نہیں رہوں گا۔"

چنانچہ یہ لشکر گیا اور چالیس دن بعد کامیاب واپس آیا اور اس کا بھیجنا اس وقت نہایت مفید ثابت ہوا۔ کیونکہ دشمنوں کو جب اس کا حال معلوم ہوا تو ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اگر مسلمانوں کے پاس قوت نہ ہوتی تو یہ فوج کیسے بھیجتے۔

فتنۂ ردّت میں جب نو مسلم قبائل نے زکوٰۃ روک دی اور حضرت ابو بکرؓ نے ان سے جنگ کا ارادہ کیا تو صحابہ نے رائے دی کہ مصلحت وقت یہ ہے کہ ان کے ساتھ نرمی کی جائے۔ حضرت عمرؓ نے تو یہاں تک کہا کہ جب وہ کلمہ پڑھتے ہیں تو آپ ان سے جہاد کیسے کر سکتے ہیں۔ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا:۔

"اے عمر! جاہلیت میں تو تم بڑے جابر تھے یہ کیا ہوا کہ اسلام لا کر خوار ہو گئے۔ وحی کا سلسلہ منقطع ہو چکا اور دین کامل ہو چکا میرے جیتے جی اس میں کمی نہیں کی جا سکتی جو قبیلہ زکوٰۃ کا ایک جانور بھی روکے گا میں اس سے لڑوں گا۔"

حضرت عمر کہتے ہیں کہ یہ سُن کر میرے اوپر منکشف ہو گیا کہ ابو بکر کے دل کو اللہ نے جہاد کے لیے کھول دیا ہے۔ چنانچہ رؤسار قریش جنھوں نے آنحضرتؐ کے عہد میں اسلام کی اشاعت میں رکاوٹیں ڈالی تھیں اب اس کی تلافی کا موقع پاکر اُٹھے اور فتنۂ ردّت کو اپنی جانفشانی سے تھوڑے عرصے میں دبا دیا جس سے اسلام آگے بڑھا ورنہ اس کی اجتماعی حیثیت اسی وقت ختم ہو جاتی۔ اسی طرح جمع قرآن کا معاملہ پیش آیا جس کو حضرت ابو بکر کی منظوری سے ایک جماعت نے انجام دیا۔

ان کا زمانۂ خلافت کل دو سال ۳ ماہ دس روز رہا۔ اس میں بھی ردّت اور ایران اور روم کی جنگوں کی مشغولیت رہی جس کی وجہ سے دینی مرکزی مہمات کمتر پیش آئیں۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں اس کے مظاہر بہت واضح نظر آتے ہیں۔ ان کے نزدیک شوریٰ کی بہت اہمیت تھی۔ مہمات میں حضرت عثمانؓ۔ علیؓ۔ عباسؓ اور عبدالرحمنؓ ابن عوف وغیرہ سے رائے لیتے۔ علماء قرآن میں سے حضرت علیؓ کے علاوہ ابن مسعود۔ زید بن ثابت ابو موسیٰ اشعری اور ابی بن کعب ان کے مشیر تھے عبداللہ بن عباس اگرچہ کم سن تھے مگر چونکہ عقل و علم میں ممتاز تھے اس وجہ سے ان کو بھی ساتھ رکھتے۔ کبھی کبھی

جب کوئی اہم معاملہ پیش آتا تو تمام لوگوں کو جمع کر لیتے۔

رسول اللہ کے زمانے سے جو امراء مقرر کیے جاتے تھے ان کو ہدایت کی جاتی تھی کہ قرآن کے مطابق فیصلے کریں۔ اس میں نہ ملے تو سنت رسول کو دیکھیں۔ وہ بھی نہ ہو تو خود اجتہاد کریں۔ چناں چہ معاذ بن جبل کو یمن کی ولایت پر بھیجتے ہوئے حضور نے یہی وصیت فرمائی تھی۔

حضرت ابوبکر کے عہد میں بیشتر امراء وہی تھے جو رسول اللہ کے مقرر کیے ہوئے تھے۔ ہر ناحیہ کا امیر ناظم بھی ہوتا تھا اور قاضی بھی۔ اور اجراء حدود شرعیہ و اقامت صلوٰۃ کا فریضہ بھی اسی کے ذمہ تھا۔ حضرت عمر نے اپنے عہد میں ملکی۔ فوجی عدالتی اور تعلیمی صیغے الگ الگ کر دیے۔ ہر ایک پر جداگانہ اشخاص کو مقرر کرتے۔ امراء و قضاۃ کو رخصت کرتے وقت وہی ہدایت کرتے جو رسول اللہ نے معاذ بن جبل کو کی تھی اور اجتہاد کا اختیار دیتے۔ چناں چہ قاضی شریح کو جو اسلامی تاریخ میں سب سے ممتاز قاضی گزرے ہیں اور جو کوفہ میں ۵۷ سال تک اپنے عہدے پر رہے یہی نصیحت کی تھی کہ جب کسی معاملے میں قرآنی تعلیم یا سنت رسول نہ مل سکے تو اہل علم و صلاح سے مشورہ لینے کے بعد اپنے اجتہاد سے فیصلہ کرنا۔

امراء ولایات و قضاۃ اسی کے مطابق عمل کرتے لیکن اہم معاملات میں خلیفہ کو لکھتے۔ امام شعبی کا بیان ہے کہ حضرت عمر بعض امور میں مہینوں تک غور و فکر اور اہل علم سے مشورہ کرتے۔ پھر جواب لکھتے۔

نہ صرف ملکی و مذہبی بلکہ عام اقتصادی و عمرانی معاملات بھی انھیں کی رائے سے طے ہوتے تھے فتح عراق کے بعد عثمان بن حنیف پیمائش اراضیات اور بندوبست کے کام پر لگائے گئے۔ اور تشخیص لگان خود حضرت عمر نے وہاں کے مرزبانوں اور کاشتکاروں کے مشورے سے کی۔ عراق نیز مصر میں نہریں انھیں کے حکم سے نکالی گئیں اور کوفہ،

بصرہ اور فسطاط وغیرہ انھیں کی صواب دید سے آباد کیے گئے۔ فتح کے بعد عراق کو مجاہدین فوج میں تقسیم کر لینا چاہتے تھے مگر حضرت عمر نے اس کو حکومت کا حق قرار دیا اسی طرح مصر میں حضرت عمرو بن عاص سے وہاں کے والی مقوقس نے اپنی پوری قبطی قوم کی طرف سے صلح کرلی تھی اور عہد کیا تھا کہ وہ رومیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کی سامان رسد سے مدد کرے گی۔ لیکن اسکندریہ کے اطراف کے باشندوں نے اس کی خلاف ورزی کی۔ یعنی رومیوں کو مدد دی اور مسلمانوں کو نقصان پہنچایا۔ فتح کے بعد حضرت عمر نے ان کے جرائم معاف کر کے ان کو ذمیوں میں شامل کر دیا اور فرمایا کہ جاؤ اپنی ملکیتوں پر قبضہ کرو اور اپنے گھروں میں رہو۔ یعنی انھوں نے پورے مصر کی فتح کو صلحاً قرار دیا۔

حضرت عثمان کے عہد میں بھی بعینہٖ یہی مرکزیت قائم رہی جو حضرت عمر کے زمانے میں تھی اور وہی نظام تھا جو چلا آتا تھا۔

مرکز کعبہ

اسلام کا اجتماعی مرکز مکہ مکرمہ ہے جہاں حج کے موقع پر دینی۔ دنیاوی ملکی اور سیاسی ہر قسم کے معاملے طے ہو سکتے ہیں۔ خلافت راشدہ میں امراء ولایات حج کے موسم میں وہاں آتے۔ بیشتر خلیفۂ وقت خود امیر الحاج ہوتا اگر کسی وجہ سے نہ آ سکتا تو کسی کو اپنا قائم مقام بنا کر بھیجتا۔ خلیفہ اوّل اپنے دو سالہ عہد میں ایک بار خود تشریف لائے۔ دوسری بار حضرت عثمان کو اپنی جگہ بھیجا۔ حضرت عمر اس کا سب سے زیادہ خیال رکھتے تھے۔ ہر سال آتے۔ صرف پہلے سال نہیں آسکے تھے اور عبدالرحمٰن بن عوف کو بھیجا تھا۔ حضرت عثمان بھی بجز دو سال کے کبھی اپنے عہد خلافت میں حج سے غیر حاضر نہ رہے۔ بے شک حضرت علی اندرونی جھگڑوں کی وجہ سے اپنی خلافت میں کبھی مکّہ نہ آ سکے مگر نائب بھیجتے رہے۔ غالباً انھیں اندرونی شورشوں کی وجہ سے ان کے عہد میں شوریٰ بھی متروک رہا۔

الغرض خلافت راشدہ میں خلیفہ کی ذات میں امت کی مرکزیت تھی۔ وہ اللہ و رسول کا نمائندہ تھا۔ امت کے سامنے اور ہر امر میں مسئول اور ذمہ دار۔ حضرت عمر نے عمرو بن عاص سے حساب طلب کرتے ہوئے ان کو لکھا تھا کہ اگر اقصائے مصر میں بھی کوئی اونٹ ضائع ہو جائے تو میں ڈرتا ہوں کہ کہیں اللہ مجھ سے اس کی بازپرس نہ کرے۔

منصب تشریع

امور شرعیہ میں خلیفہ کو کوئی اس قسم کی دینی ریاست حاصل نہیں تھی کہ جو حکم دیدے وہ مذہبی مسئلہ بن جائے بلکہ صرف احکام شریعت نافذ کرنے کا مجاز تھا۔ اور تشریع کی بنیاد قرآن اور سنت (عمل رسول) پر تھی جس امر کے متعلق کوئی تعلیم ان دونوں میں نہ ملتی خلیفہ خود اور اس کے مشیر نظایر پر قیاس کر کے اس کا کوئی حکم نکالتے۔ سب متفق ہو جاتے تو اس کو اجماع کہتے اور اگر باہم اختلاف ہوتا تو خلیفہ انھیں میں سے کسی صورت کو ترجیح دے کر اس کے مطابق حکم دے دیتا۔ اس کو اپنے عہدے کے لحاظ سے استنباط مسائل میں دیگر مجتہدوں سے کوئی خاص امتیاز حاصل نہ تھا اس کا فریضہ بس یہ تھا کہ اُمّت کے امور کو قرآن اور اسوۂ رسول کی روشنی میں چلاتا رہے۔

بیعت کرتے وقت اس سے یہ شرط لی جاتی تھی کہ کتاب و سنت کے مطابق عمل کرے گا۔ حضرت عثمان کی بیعت میں سنت شیخین یعنی ابوبکر و عمر کا لفظ بھی بڑھایا گیا لیکن یہ زیادتی حضرت علی نے نہیں منظور فرمائی اس لیے حذف کر دی گئی کیونکہ شیخین رضؓ نہ معصوم تھے نہ ان کی تقلید کسی قرآنی حکم پر مبنی تھی۔

بنی اُمیّہ

جن لوگوں نے عراق و مصر سے آکر حضرت عثمان کے گھر کا محاصرہ کیا اور ان کو قتل کر ڈالا۔ وہ سب کے سب قرآن کی رو سے اللہ و رسول سے باغی اور واجب القتل تھے۔ اس لیے بیعت خلافت کے بعد صحابہ نے حضرت علی سے مطالبہ کیا کہ قاتلوں سے قصاص لیا جائے۔ حضرت علی کو انھیں قاتلوں نے خلیفہ بنایا تھا اور وہی ان کے حامی تھے اس وجہ سے وہ ان سے قصاص نہ لے سکے اور اس جھگڑے نے بہت طول کھینچا۔

سب سے پہلے حضرت طلحہ اور زبیر جو اُن چھ صحابۂ کبار میں سے تھے جن کو حضرت عمر نے خلافت کے لیے نامزد فرمایا تھا اس مطالبے کے لیے اٹھے۔ اپنے ساتھ حضرت عائشہ کو بھی لے لیا اور بصرہ میں پہنچ کر قصاص لینا شروع کیا۔ لیکن حضرت علی لشکر لے کر مقابلے کے لیے پہنچ گئے اور بہت جلد شکست دے دی جس میں یہ دونوں حضرات مارے گئے۔ مگر خلیفۂ مقتول کے خون کے اصلی ولی امیر معاویہ تھے جن کے پاس شام کی منظم فوج تھی۔ ان سے اور حضرت علی سے صفین میں مقابلہ ہوا جس میں عراقی فوجوں کو چیرہ دست دیکھ کر شامیوں نے نیزوں پر قرآن اُٹھائے۔ اس کی رو سے فیصلہ کرنے کے لیے فریقین کی طرف سے دو حکم مقرر ہوئے جنھوں نے حضرت علی اور معاویہ دونوں کو خلافت سے معزول کیا اور اُمّت کو اختیار دیا کہ اور کسی کو اپنا خلیفہ منتخب کر لے۔

اب حضرت علی کو سخت دشواریوں کا سامنا ہوا۔ ایک تو خود ان کی فوج میں سے خارجیوں کی جماعت پیدا ہو گئی جو ان کے مقابلے کے لیے آہنی دیوار کی طرح جم گئی دوسرے امیر معاویہ کو موقع مل گیا۔ انھوں نے شامیوں سے بیعت لے کر اپنی خلافت کا اعلان کر دیا اور قوت سے کام لینے لگے۔ تیسرے فیصلۂ ثالثی کے بعد آئینی طور پر

خود ان کی خلافت ختم ہوگئی۔ کیونکہ دونوں طرف سے یہ عہد تھا کہ جو متفقہ فیصلہ ہوگا۔ اس
پر فریقین کو عمل کرنا ہوگا۔ اسی وجہ سے اہل کوفہ ان کے احکام پر عمل کم کرتے تھے۔ انھیں
حالات میں ایک خارجی عبدالرحمٰن بن ملجم نے ان کو خنجر سے ہلاک کر دیا۔

ان کی جگہ اہل عراق نے ان کے بڑے بیٹے امام حسن کے ہاتھ پر بیعت کی۔ امیر
معاویہ فوجیں لے کر کوفہ کی طرف آئے اور ان کو شکست دے دی۔ انھوں نے صلح کی
خواہش کی۔ امیر معاویہ نے ایک سادہ قرطاس پر نیچے دستخط بنا کر ان کے پاس بھیج دیا
کہ جو شرائط آپ چاہیں لکھ دیں۔ امام حسنؓ نے لکھا:۔

۱۔ اہل عراق کو امن دیا جائے اور گزشتہ لڑائیوں کے انتقام میں کسی کی گرفت نہ ہو۔

۲۔ صوبۂ اہواز کا خراج مجھے ملتا رہے اور میرے بھائی حسینؓ کو ۲۰ لاکھ درہم سالانہ
دیئے جائیں۔

۳۔ عطیہ اور صلے میں بنی ہاشم دوسروں سے مقدم رکھے جائیں۔

کتب تاریخ میں عہد نامہ کا مضمون یہی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اسلام میں سب سے
پہلی شاہانہ مصالحت یہی ہے جس میں امیر معاویہ نے بیت المال کی رقم دے کر سلطنت
حاصل کی جو جمہور کا حق تھی۔

بادشاہت

۲۵ ربیع الاول سنہ ۴۱ھ کو امام حسنؓ سے صلح کی تکمیل کے بعد امیر معاویہ کے ہاتھ پر
بیعت عام ہوئی۔ اور وہ ساری امت کے خلیفہ ہو گئے۔ اسی تاریخ سے اسلامی خلافت
بادشاہت میں تبدیل ہوگئی۔ کیونکہ یہ حکومت الٰہی نہ تھی جو رسول اللہ نے قائم کی تھی اور
جس کو خلفائے راشدین نے اپنی کوشش سے قوی اور وسیع بنا کر دنیا کی قوموں کے لیے
امن۔ ہدایت اور مساوات کا مرکز بنا دیا تھا۔ بلکہ انسانی حکومت تھی جس کو قرآن نے نبی اور
رسول تک کے لیے جائز نہیں قرار دیا ہے۔

علماء اسلام میں امیر معاویہ کی موافقت اور مخالفت میں شروع سے دو گروہ ہیں جن میں بحث کا سلسلہ جاری ہے۔ میں اس میں قدم نہیں رکھ سکتا کیونکہ وہ مذہبی بحث ہے اور میرے موضوع سے خارج۔ میرا حق اسی قدر ہے کہ واقعات کو پیش کروں۔

(۱) امیر معاویہ حضرت عثمان کے زمانے سے پورے شام کے والی ہو گئے تھے۔ اور اندرونی طور پر ہر امر میں خود مختار تھے۔ اور بیت المال پر شاہانہ تصرف رکھتے تھے۔ چنانچہ اس معاملے میں حضرت ابوذر نے ان سے جھگڑا بھی کیا تھا۔ اور خلیفہ ہو جانے کے بعد اُن رئیسوں اور سرداروں کو جن سے مقاصد میں تائید کی امید ہوتی بڑے بڑے انعامات اور عطیے دیتے۔

اس کے مقابلے میں خلافت راشدہ کے بھی چند واقعات سامنے رکھیے۔

خلیفۂ اول اپنے گزارے کے لیے بیت المال سے جو رقم لیا کرتے تھے مرتے وقت وصیت کر گئے کہ میری فلاں زمین بیچ کر وہ ساری رقم واپس کر دی جائے جو آج تک میں نے لی ہے۔ غالباً دل میں یہ اندیشہ تھا کہ اس کے مطابق میں امت کی خدمت نہیں کر سکا ہوں۔

خلیفۂ دوم نے ایک بار قیصر روم کو خط بھیجا تو ان کی بیوی ام کلثوم نے اسی قاصد کو قیصرہ کے لیے اپنی طرف سے کچھ تحفے دیئے۔ اس نے ان کے لیے ہدیے بھیجے۔ جس میں موتی کی ایک بیش قیمت مالا تھی۔ حضرت عمر کو جب علم ہوا تو اس کو لے کر بیت المال میں داخل کر دیا۔ لوگوں نے کہا کہ یہ ملکۂ روم نے بھیجا ہے جو نہ آپ کے زیر فرمان ہے نہ اس کے مال سے آپ کو کچھ تعلق ہے۔ فرمایا کہ قاصد مسلمانوں کا تھا اور اس کے اخراجات بیت المال سے دیئے گئے تھے۔ اسی طرح جب ان کے دونوں بیٹے عبداللہ و عبیداللہ جو عراق کی فوج میں تھے مدینے واپس آنے لگے تو والی بصرہ حضرت ابوموسیٰ اشعری نے کہا کہ یہاں خزانہ میں ایک رقم جمع ہے جس کو میں خلیفہ کے پاس بھیجنا چاہتا ہوں۔ تم

دونوں اس کو لے کر یہاں سے تجارتی مال خرید لو مدینے میں پہنچ کر فروخت کر دینا اور رقم بیت المال میں داخل کر دینا۔ اُنھوں نے ایسا ہی کیا۔ حضرت عمر نے فرمایا کہ اس کا نفع کہاں ہے؟ جواب دیا کہ یہ مال والی بصرہ نے ہم کو قرض دیا تھا۔ اب ہم نے وہ قرض واپس کر دیا۔ فرمایا کہ صرف امیرالمومنین کے بیٹوں کو قرض دیا گیا تھا یا ساری فوج کو؟ یہ سُن کر بڑے بیٹے چپ ہو گئے۔ چھوٹے نے کہا کہ اس کی ذمہ داری بھی تو ہمارے اوپر تھی۔ اگر ضائع ہو جاتا تو ہم کو اپنے پاس سے دینا پڑتا۔ اس پر لوگوں نے فیصلہ کیا کہ منافع میں سے نصف ان دونوں کو دیا جائے اور نصف بیت المال میں داخل ہو۔

حکومت الٰہی اور حکومت انسانی کا فرق دیکھنے کے لیے یہ جزئی واقعات کافی ہیں۔ خلیفہ کا قبضہ بیت المال پر صرف محافظانہ ہے وہ ایک پائی کا بھی مالک نہیں ہے مگر مستبد اپنے آپ کو پائی پائی کا مالک سمجھتا ہے۔

(۲) مالک اشتر نخعی کو جب حضرت علی نے محمد بن ابوبکر والی مصر کی امداد کے لیے بھیجا تو راستے میں مقام قلزم میں پہنچ کر ان کا انتقال ہو گیا۔ لوگوں نے شبہ کیا کہ امیر معاویہ نے زہر دلوا دیا۔

(۳) امام حسن رضؓ کی وفات پر بھی ایسا ہی خیال کیا گیا۔

(۴) عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید جو حمص میں قیام پذیر تھے اپنے شجاعانہ کارناموں اور کریمانہ صفات کی وجہ سے شام میں اس قدر محترم اور ہر دلعزیز تھے کہ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ امیر معاویہ کے بعد ان کے سوا کوئی دوسرا خلیفہ نہیں ہو سکتا۔ ایک دن اچانک ان کی موت واقع ہو گئی۔ پھر پتہ لگ گیا کہ ابن اثال نصرانی نے جو امیر معاویہؓ کا خاص طبیب ہے ان کو دوا میں زہر دیا تھا۔ چنانچہ ان کے بھتیجے نے مدینے سے پہنچ کر اس طبیب کو شارع عام پر قتل کر دیا۔ جب گرفتار ہو کر امیر معاویہ کے سامنے پیش کیے گئے اور انھوں نے پوچھا کہ تم نے کیوں میرے طبیب کو مار ڈالا تو

کہا کہ ابھی میں نے مامور کو قتل کیا ہے آمر کا قتل کرنا باقی ہے۔

یہ سب اگرچہ مورخوں کے شبہات ہیں جن سے اصولاً کوئی ملزم نہیں قرار دیا جا سکتا مگر شتبہ ضرور ہو جاتا ہے۔

(۵) کوفہ کے کندی قبیلے کے نامور رئیس حجر بن عدی اور ان کے تیرہ ساتھیوں کو وہاں کے والی زیاد نے اس جرم میں پکڑ کر امیر معاویہ کے پاس بھیجا کہ یہ ان کی برائی کرتے ہیں اور بغاوت کے لیے آمادہ ہیں۔ یہ لوگ جب مرج عذرا میں پہنچے تو وہاں امیر معاویہ کے حکم کے مطابق ان میں سے آٹھ آدمی قتل کر دیے گئے جن میں سے حجر بھی تھے۔ حضرت عائشہ رضؓ نے حجر کی گرفتاری کا حال سن کر عبدالرحمٰن بن حارث کو امیر معاویہؓ کے پاس سفارش کے لیے بھیجا تھا مگر ان کے پہنچنے سے پہلے قتل کیے جا چکے تھے۔ ام المومنین کو ہمیشہ اس کا افسوس رہا کیونکہ حجر بہت بزرگ اور عابد آدمی تھے۔

(۶) ان کے وُلاۃ بھی خون ناحق اور ظلم سے کم پرہیز کرتے تھے۔ خاص کر عراق میں زیاد کی سختیاں نہایت جابرانہ تھیں۔

(۷) ان کی زندگی کے آخری واقعہ یعنی یزید کی ولی عہدی کی بیعت نے جو انھوں نے فوجی قوت کے دباؤ سے لی رہی سہی حکومت الٰہی کی امید کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اور اسلامی اخوت و مساوات کو منہدم کر کے شہنشاہیت کی بنیاد ڈال دی۔

بعض لوگ ان کی طرف سے یہ معذرت کرتے ہیں کہ اس زمانے میں سلطنت کے حدود بہت وسیع ہو گئے تھے اور ذرائع الحاق واتصال موجود نہ تھے اس لیے خلافت کے امیدواروں کی جس قدر زیادتی ہوتی اسی قدر امت میں فتنہ اور تفرقہ کا زیادہ خوف ہوتا۔ ایسی حالت میں امیر معاویہ نے اگر اس کو ایک خاندان میں محدود کر دیا تو کیا بیجا کیا۔

لیکن یہ معذرت نہ صرف اسلام سے بلکہ حالات سے بھی ناواقفیت پر مبنی ہے اسلام کا اصل مقصد حکومت الٰہی کا قیام ہے۔ اگر وہ نہیں تو کچھ نہیں کیونکہ انفرادی اسلام

سے اجتماعی فلاح ناممکن ہے۔ اس لیے وہ کسی قیمت پر فروخت نہیں کی جا سکتی۔ اور اگر امیر معاویہ بجائے اپنے بیٹے کے امام حسین کو یا حضرت عمر کے بیٹے عبداللہ کو جن کو ابوموسیٰ اشعری نے تحکیم کے موقع پر خلافت کے لیے موزوں قرار دیا تھا ولی عہد بنا دیتے تو غالباً نہ تو فتنہ ہوتا نہ فساد۔ بلکہ امت ان کی ممنون ہوتی۔

یزید کو ولی عہد بنانے میں امیر معاویہ نے حضرت ابوبکر کے عمل سے نظیر لی تھی لیکن صدیق اکبر نے حضرت عمر کو اپنا ولی عہد بنایا تھا جو نہ ان کے ہم قبیلہ تھے نہ رشتہ دار اس لیے بلاشبہ ان کا مقصد جمہوری تھا جس میں کوئی شائبہ ذاتی یا خاندانی غرض کا نہ تھا اور یہاں یزید کو ولی عہد بنانے کی غرض صرف یہ تھی کہ سلطنت اپنے خاندان میں رہے۔ اور افسوس کہ یہ غرض بھی پوری نہ ہو سکی کیونکہ ان کے بعد یزید کل ۳ سال آٹھ ماہ تخت پر رہا جس کے بعد سفیانی خاندان سے حکومت نکل گئی اور بنی مروان کے ہاتھ میں آ گئی۔ یہاں تک کہ ۱۳۲ھ میں عباسیوں نے ان ہی سے اس کو چھینا۔

صحابہ کا سکوت

صحابہ کرام جو آنحضرت اور خلفاء راشدین کا زمانہ دیکھ چکے تھے۔ بالعموم یہ سمجھتے تھے کہ کیا اس کے خلاف بھی کوئی طریقہ اسلامی حکومت کا ہو سکتا ہے۔ اس لیے حضرت حسن کے بجائے معاویہ خلیفہ ہو گئے تو کیا ہوا۔ کیوں کہ شخصیتوں کی اہمیت ان کی نگاہوں میں زیادہ نہیں تھی۔ امیر معاویہ کا طریقہ یہ تھا کہ لوگوں کے ساتھ فیاضی اور مہربانی سے پیش آتے۔ اگر کوئی سخت بات کہتا تو اس کو برداشت کرتے بلکہ اس کی اور مدارات کرتے۔ احنف بن قیس بنی تمیم کے میر قبائل کوفہ کے سب سے بڑے رئیس اور شجاعت و مروت و دیگر صفات کی وجہ سے جملہ عربی رؤسا میں ممتاز تھے۔ جب تلوار میان سے نکالتے تو بے چون و چرا ایک لاکھ تلواریں ساتھ دینے کے لیے نکل پڑتیں۔ جنگ صفین میں حضرت علی کے ساتھ تھے۔ خلیفہ ہو جانے کے بعد امیر معاویہ کبھی کبھی ان کو دمشق میں بلاتے اور

بہت اکرام کے ساتھ پیش آتے۔ ایک بار اثنائے گفتگو میں ان سے کہا کہ صفین میں تمہاری شرکت کی خلش کبھی کبھی دل میں تازہ ہو جاتی ہے۔ احنف نے جواب دیا کہ اب تک وہی دل ہمارے سینوں میں ہیں اور وہی تلواریں ہمارے میانوں میں۔ اگر تم جنگ کی طرف ایک بالشت بڑھنا چاہتے ہو تو ہم ایک ہاتھ بڑھنے کو تیار ہیں۔

باوجود ان باتوں کے ان کی توقیر اس حد تک کرتے کہ جس والی کو وہ ناگوار سمجھتے اس کو فوراً بدل دیتے۔

اس طرح پر انھوں نے اپنے استبداد کو حلم اور کرم سے چھپا رکھا تھا۔ چنانچہ ان کے پورے عہد میں جو ۲۰ سال رہا نہ کوئی فتنہ برپا ہوا نہ کوئی بغاوت رونما ہوئی اور بجز خوارج کے کوئی ان کی مخالفت کے لیے نہ اُٹھا۔

بے شک صحابہ کرام میں ایسے لوگ بھی تھے جو انسانی حکومت کے مظاہر آنکھوں سے دیکھتے تھے۔ مگر ان کی قوت کے آگے اپنے آپ کو بے بس پاتے تھے۔ اس وجہ سے لایکلف اللہ نفساً الا وسعہا (اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بار نہیں ڈالتا) کے مطابق مجبوراً خاموش رہے۔

واقعۂ کربلا

امیر معاویہ کے بعد جب ان کا بیٹا یزید خلیفہ ہو گیا تو امام حسینؓ جن کا رتبہ اس وقت صحابہ میں ممتاز تھا مقابلے کے لیے کھڑے ہوئے۔ مگر اس مہم میں کامیاب نہ ہو سکے بظاہر اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس استبداد کو توڑنے کے لیے جس طاقت کی ضرورت تھی اس کو فراہم کرنے کی طرف انھوں نے کوئی توجہ نہیں کی۔ مدینے سے مکے آجانے کے بعد پورا موقع حاصل تھا کہ کچھ عرصے کوشش کر کے امت کے بہت سے افراد اور بڑے بڑے لوگوں کو اپنے ساتھ کر لیتے لیکن انھوں نے اسی کو کافی سمجھا کہ کوفہ میں جہاں سے ان کی طلبی کے خطوط آرہے تھے مسلم کو بھیج کر اپنی امامت کی بیعت لیں۔ حالانکہ اہل کوفہ کی بیوفائی کا حضرت علی اور امام حسن کے زمانوں میں خود ان کو تجربہ ہو چکا تھا۔ یہ بیعت بھی والیوں کے

ڈر سے مخفی سازش کی طرح راتوں کو چھپ چھپ کرلی جاتی تھی۔ظاہر ہے کہ ایسی جماعت کیا کام دے سکتی۔چنانچہ جب مسلم ابن زیاد کے قصر پر حملے کے لیے بڑھے اور یا منصور کا نعرہ لگایا تو اٹھارہ ہزار آدمیوں میں سے جو ان کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے کل چار ہزار جمع ہوئے۔اس وقت ابن زیاد کے پاس پچاس آدمیوں سے زیادہ نہ تھے انھیں کے خوف سے تقریباً وہ سارے کے سارے مسلم کا ساتھ چھوڑ کر بھاگ گئے۔آخر مسلم معہ اپنے بیٹوں کے گرفتار کر کے قتل کر دیے گئے اور جب امام حسین وہاں پہنچے تو مدد کے لیے کوئی جماعت تیار نہ ملی۔

بنی مروان

مروان اپنی خلافت مکمل کرنے سے پہلے ہی وفات پا گیا۔اس کے بیٹے عبدالملک نے اپنے مخالفوں کو شکستیں دے کر پورے اسلامی ممالک پر تسلط حاصل کیا۔اس کے عہد میں استبداد کا مظہر بہت نمایاں ہوگیا۔اپنے مقاصد کو پورا کرنے میں اس نے جن سختیوں سے کام لیا تھا ان کی معذرت میں کہا کرتا تھا کہ اگر شیخین کو بھی ایسے سرکش لوگوں سے پالا پڑتا جن سے ہم کو پڑا ہے تو لا محالہ وہ بھی یہی کرتے۔اسی کا سب سے بڑا معتمد والی حجاج بن یوسف تھا جو اپنے ظلم و ستم میں چنگیز اور ہلاکو سے کم بدنام نہیں ہے۔عبدالملک کے بیٹے سلیمان نے خلیفہ ہو جانے کے بعد اس غصے میں کہ حجاج نے اس کو ولی عہدی سے خارج کرانے میں ولید کی موافقت کی تھی اس کے تمام رشتہ داروں اور ماتحت عاملوں کو سزائیں دیں اور اس کے بھتیجے محمد بن قاسم فاتح سندھ کو بھی مروا ڈالا۔اسی طرح موسیٰ بن نصیر جیسے سپہ سالار سے جس نے اندلس فتح کیا تھا ناقابل برداشت جرمانہ وصول کیا۔

بالعموم مروانی خلفا خاص کر ہشام بن عبدالملک نے اپنے شاہی اغراض کے لیے عربی قبائل میں زمانۂ جاہلیت کی عصبیت کو جسے اسلام نے فنا کر دیا تھا پھر زندہ کر دیا

اور ان کو باہم ایک دوسرے کا دشمن بنا کر لڑانا شروع کیا۔ بے شک ان میں سے حضرت عمر بن عبدالعزیز کا عہد مستثنیٰ ہے۔ اُنھوں نے خلیفہ ہوتے ہی رؤسا بنی امیہ کی ملکیتیں اور جائدادیں جن پر اُنھوں نے زبردستی قبضہ کر رکھا تھا ان کے اصلی حقداروں کو واپس دلائیں بنی اُمیہ پر یہ امر نہایت گراں گزرا۔ وہ ان کی پھوپھی فاطمہ بنت مروان کو جن کا وہ بہت ادب کرتے تھے بلا لائے تاکہ ان کو سمجھائیں۔ جب انھوں نے آکر سفارش کی تو عمر بن عبدالعزیز نے کہا:۔

"اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کے لیے رحمت بنا کر بھیجا تھا۔ آپ نے ایک ایسا چشمہ چھوڑا جس میں سب کو یکساں پینے کا حق تھا۔ آپ کے بعد ابوبکرؓ و عمرؓ نے بھی اس کو اسی حالت میں رکھا۔ جب وہ یزید، مروان، عبدالملک ولید اور سلیمان کے ہاتھوں میں آیا۔ اُنھوں نے اس سے نہریں نکالیں جن کے باعث وہ خشک ہو گیا۔ اب جب تک وہ پھر اپنی اصلی حالت پر نہیں لایا جائے گا۔ لوگ اس سے سیراب نہیں ہو سکیں گے"

فاطمہ نے یہ سُن کر کہا کہ تمھارے بھائیوں کے اصرار سے میں تم کو سمجھانے آئی تھی مگر جب تمھارا خیال ایسا ہے تو میں اب کچھ نہ کہوں گی۔ ان کے بعد ولی عہد یزید تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ نہ صرف اس سے بلکہ بنی اُمیّہ سے خلافت کو نکال دیں اور کچھ عجب نہیں کہ بعض مورخوں کا یہ بیان صحیح ہو کہ اسی خوف سے بنی اُمیّہ نے عجلت کر کے ان کو زہر دے دیا جس سے وہ ہلاک ہو گئے۔ ان کا کل زمانۂ خلافت ڈھائی سال سے بھی کم رہا۔ اس ڈھائی سال کے سوا بنی اُمیّہ اپنی ۹۲ سال کی خلافت میں بادشاہت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ حکومت الٰہی کا مفہوم ہی اُمّت کے دماغوں سے جاتا رہا۔ خلفاء راشدین نہ محافظ رکھتے تھے نہ دربان مگر خلفاء بنی اُمّیہ کے لیے جامع مسجد میں بھی مقصورے بنائے جاتے تھے اور جب وہ نماز پڑھتے اس وقت دائیں بائیں مسلح سپاہی کھڑے رہتے۔ خلافت راشدہ میں عمل کتاب و سنت پر تھا۔ مگر عہد بنی امیہ میں جبر و قہر کی حکمرانی رہی۔ خلفاء راشدین معمولی افراد کی طرح زندگی بسر کرتے

سے تھے اور بیت المال کی خود اپنے مال سے زیادہ حفاظت کرتے تھے لیکن خلفاء بنی اُمیہ شاہانہ شان و شوکت سے رہتے تھے اور بیت المال کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ میں فرمایا تھا کہ جو شخص مجھ میں کوئی کجی دیکھے اس کو سیدھا کر دے اور عبدالملک نے برسر منبر کہا کہ آج سے جو کوئی اس مقام پر مجھ سے کہے گا کہ اللہ کا خوف کرو اس کو قتل کر دوں گا۔

خلفاء راشدین عام مسلمانوں کی طرح بازاروں میں پھرتے مسجدوں میں جا کر نماز پڑھاتے اور سب کے ساتھ مل کر بیٹھتے۔ لیکن ولید جس وقت مسجد نبوی دیکھنے گیا ہے۔ اس وقت وہاں سے سب لوگ نکال دیے گئے۔ شیخ مدینہ سعید بن المسیب کی بزرگی کا اگر احترام نہ ہوتا تو وہ بھی اس میں رہنے نہ پاتے۔

خلفاء راشدین کے لیے کوئی امتیازی علامت نہیں تھی لیکن بنی امیہ کے عہد میں ہم عصائے خلافت کا بھی ذکر پاتے ہیں۔ نیز ان میں سے یزید بن عبدالملک اور ولید بن یزید کی نسبت مینوشی اور مغنیات کے راگ سننے کی روایتیں بھی ہمارے کانوں تک پہنچی ہیں۔

الغرض جس دن سے امیر معاویہ کے ہاتھ پر بیعت ہوئی اسی دن سے حکومت الٰہی جو دین کا اصل مقصود تھی ختم ہو گئی۔ اُمّت اسلامیہ جس کا ہر فرد آزاد اور صرف اکیلے اللہ کا بندہ تھا رفتہ رفتہ قوت و غلبہ سے انسانی حکومت کی تابعدار اور رعایا بنائی گئی۔ اور بجز عمر بن عبدالعزیز کے بنی امیہ نے دینی قیادت ایک دن بھی نہیں کی جس سے امت میں مذہبی انتشار اور تشتت پیدا ہو گیا۔

بزرگان اُمّت قرب عہد خلافت راشدہ کی وجہ سے ان سے خلفاء کا کام لینا چاہتے تھے مگر ان کی مخصوص سیاست سے قرآن خارج ہو چکا تھا اور خاندانی اغراض نے اس کی جگہ لے لی تھی۔ اس لیے دن بدن خرابیاں بڑھتی گئیں۔ اگر حکومت الٰہی ہوتی تو ان کی تقریباً صد سالہ خلافت میں بلاشبہ ساری دنیا میں اسلام پھیل جاتا۔

بنی عبّاس

عباسیوں نے کسی شرعی استحقاق کی بنا پر نہیں بلکہ محض قرابت رسول کے دعوے پر خفیہ سازش اور کوشش سے خلافت حاصل کی۔ صورت یہ ہوئی کہ شیعہ جو مخفی طور پر اُمّت میں اہل بیت کی امامت کی تلقین کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ بنی اُمیّہ کا تختہ الٹ دیں۔ ان میں ایک فرقہ کیسانیہ تھا جو ابو ہاشم بن محمد بن الحنفیہ کو اپنا امام مانتا تھا۔ ابن الحنفیہ حضرت علی کے بیٹے تھے جنھوں نے اگرچہ عبدالملک بن مروان کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی مگر ان کے شیعہ انھیں کو خلافت کا حقدار سمجھتے تھے اور ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے ابو ہاشم کو۔

خلفاء بنی اُمیّہ نے علی بن عبداللہ بن عباس کو ایک گاؤں حمیمہ جاگیر میں دیا تھا جو مدینے سے دمشق کے راستے میں پڑتا تھا۔ علی اسی گاؤں میں سکونت رکھتے تھے۔ اتفاقاً ابو ہاشم کا ادھر گزر ہوا اور وہیں بیمار ہو کر وہ انتقال بھی کر گئے۔ چونکہ اُنھوں نے کوئی بیٹا نہیں چھوڑا تھا۔ اس وجہ سے بنی عباس نے دعوے کر دیا کہ وہ علی بن عبداللہ کو اپنے حق امامت کی وصیت کر گئے ہیں یہیں سے عبّاسیوں میں خلافت کا داعیہ پیدا ہو گیا۔ اور فرقہ کیسانیہ نے ان کی حمایت شروع کی۔ لیکن علی صرف نام کے وصی تھے، کام جو کچھ کیا ان کے بیٹے محمد نے کیا اور وہی ان کے بعد امام بھی قرار پائے۔

محمد نہایت عقیل اور دانشمند تھے۔ اُنھوں نے صورت حال پر نظر ڈالی۔ علویہ کی ناکامی کے اسباب پر غور کیا اور سوچا کہ خلافت و سلطنت کو ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں منتقل کرنا صرف فوری جوشش سے ممکن نہیں ہے تاوقتیکہ کثیر تعداد اور کافی قوت اس مقصد کے لیے تیار نہ کر لی جائے۔ اس وجہ سے اُنھوں نے اپنے شیعہ میں سے داعیوں کی جماعت منتخب کی جو لوگوں میں صرف اہل بیت کی امامت کی تبلیغ کریں اور کسی

خاص امام کا نام نہ لیں۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ تھا کہ شیعہ امامیہ کی محنت سے نفع اٹھائیں جو مدت سے اہل بیت کی امامت کی تبلیغ کر رہے تھے اور اس کے لیے راستے ہموار کر چکے تھے۔ دوسرا یہ کہ امام کے نام کی تعیین سے خطرہ تھا کہ بنی اُمّیہ کو خبر ہو گی تو قتل کر دیں گے۔

تبلیغ کے لیے اُنھوں نے مختلف وجوہ سے خراسان کو زیادہ موزوں پایا اور دوسری صدی ہجری کے آغاز سے کام شروع کیا۔ مسلسل ۲۹ سال تک مخفی طور پر سوداگروں اور سیّاحوں وغیرہ کے بھیس میں ان کے دعاۃ وہاں تبلیغ کرتے رہے اور جب پورا اثر پیدا کر لیا اس وقت امام موصوف کے خاص معتمد ابو مسلم خراسانی نے پہنچ کر قوت سے کام لینا شروع کیا اور رفتہ رفتہ امرا بنی اُمّیہ کو شکست دیتے ہوئے کوفہ پر پہنچ کر قبضہ کر لیا۔

اعلان خلافت

۱۲ ربیع الاوّل ۱۳۲ھ کو امام محمد کے بھائی سفاح کی خلافت کا اعلان کیا گیا۔ سفّاح نے منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ میں حمد و صلواۃ کے بعد اپنی قرابت رسول پر فخر کیا۔ پھر بنی اُمّیہ کے ظلم و ستم کا ذکر کر کے کہا:-

"ہم اہل خیر و صلاح ہیں۔ ہم سے ظلم و فساد کا اندیشہ نہیں ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ تم لوگوں کو ہمارا زمانہ مل گیا اور اس دولت کی سعادت حاصل ہو گئی"۔

اس کے بعد اس کے چچا داؤد نے کہا:-

"ہم نے اس خلافت کو زر و جواہر جمع کرنے کے لیے نہیں حاصل کیا ہے۔ نہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ عالیشان محلات اور باغات بنائیں اور ان میں نہریں نکالیں بلکہ ہم نے دیکھا کہ ہمارے حقوق ہضم کیے جا رہے تھے۔ ہمارے بنی اعمام کی تحقیر کی جاتی تھی۔ امت کے جان و مال پر دست درازیاں ہوتی تھیں ان کو

ہم برداشت نہیں کر سکے۔ اب اللہ، رسول اور ان کے عم محترم عباس کا ذمّہ ہے
کہ ہم تمہارے ساتھ کتاب و سُنّت کے مطابق برتاؤ رکھیں گے اور وہی طریقہ رکھیں
گے جو رسول اللہ کا تھا۔"

لیکن ہوا کیا اس کے چند سال بعد منصور نے انبار کو چھوڑ کر بغداد کو دارالخلافہ بنایا اور باوجود
جزرس ہونے کے اپنے اور اپنے بیٹے کے قصور و باغات کی تعمیر میں تقریباً دو کروڑ دینار خرچ
کیے۔ پھر ہارون رشید کے زمانے میں وہاں امیروں اور رئیسوں کے ایسے عالی شان محلّات
تعمیر ہوئے جن کو دیکھ کر سیّاح حیران ہو جاتے تھے۔ قصر خلافت۔ وزراء کے مکانات بالخصوص
برامکہ کی عمارتیں ایسی تھیں کہ اس وقت تمام عالم میں ان کی نظیر نہ تھی۔ زر و جواہر بھی جمع کیے
چنانچہ منصور نے جب وفات پائی تو خزانے اس قدر معمور چھوڑے کہ مہدی بے دریغ ان کو
خرچ کرتا رہا اور کبھی یہ خیال نہیں کیا کہ یہ ختم ہو جائیں گے۔ ان کے دربار دارا اور کیخسرو کے
درباروں کا نمونہ بن گئے۔ غناؤ شراب عیش و نشاط وغیرہ سے دلچسپی ہوئی اور کتاب و سُنّت سے
بس اتنا لگاؤ رہا کہ وہ مسلمان تھے۔ ورنہ ان کی مخصوص سیاسیات میں نہ کتاب کو دخل تھا نہ سُنّت کو۔

بنی اُمیّہ سے انتقام

عباسیوں نے بنی اُمیہ سے جو ان کے یک جدّی بھائی تھے انتقام لینے میں جس قساوت
قلبی اور بے رحمی کا اظہار کیا اس کی مثال اسلامی تاریخ میں نہیں ملتی۔ داؤد نے مکہ اور مدینے میں
جس قدر بنی امیہ تھے سب کو قتل کر ڈالا۔ اس کے بھائی سلیمان نے بصرہ میں یہی کیا۔ جن کو
قتل کرتا ان کو کھنچوا کر راستے میں ڈال دیتا تھا۔ عبداللہ بن علی نے شام میں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر
بنی امیہ کے ایک ایک فرد کو مار ڈالا۔ یہاں تک کہ جوش انتقام میں ان کے خلفاء امیر معاویہ
یزید اور عبدالملک وغیرہ کی قبریں کھدوا ڈالیں اور ان کی بوسیدہ ہڈیوں کو نکال کر پھینک دیا۔
مورخوں کا بیان ہے کہ ہشام کی نعش صحیح سالم نکلی تھی صرف ناک گل گئی تھی اس کو کوڑوں
سے پٹوا کر سولی پر چڑھا دیا۔ پھر آگ میں جلا کر راکھ ہوا میں اُڑا دی۔

عراق میں سفاح نے خود بنی امیہ کے افراد کو قتل کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ استبداد کا مزاج شکی ہے۔ چنانچہ ان کی یہ سخت گیری بنی امیہ ہی تک محدود نہیں رہی بلکہ خود اپنے ارکان سلطنت پر بھی انھوں نے ہاتھ بڑھایا۔ ابوسلمہ خلال جو وزیر آل محمد کے لقب سے مشہور تھا اور جس نے اس دولت کے قائم کرنے میں بڑی خدمات انجام دی تھیں اس سے سفاح اس بنیاد پر ناراض تھا کہ اس نے خلافت کو آل علی کی طرف منتقل کرنا چاہا تھا۔ اس کے حکم سے ابومسلم نے اس کو قتل کرا دیا۔ سلیمان بن کثیر خزاعی شیخ النقباء پر بھی جس نے اس سلطنت کو قائم کرنے میں ابوسلمہ سے کم کوشش نہیں کی تھی ابومسلم نے یہی الزام لگایا کہ وہ آل علی کا خیر خواہ ہے اور اس کو بھی قتل کر دیا۔ سفاح کے بعد جب منصور تخت خلافت پر آیا تو اس کو ابومسلم کی طرف سے شک پیدا ہوا چنانچہ اس کو دربار میں بلوا کر قتل کرا دیا نیز اپنے چچا عبداللہ بن علی کی طرف سے بھی اس کے دل میں خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے باوجود امان نامہ لکھ دینے کے بھی اس کو قید کر دیا جس میں وہ مر گیا۔

علویہ پر سختی

اپنے ہی اعمام یعنی آل ابوطالب جن کے اوپر بنی امیہ کے مظالم دیکھ کر صبر نہیں کر سکے تھے اور ان کے انتقام کے لیے اُٹھے تھے ان کی طرف سے بھی ان کے دلوں میں بدگمانیاں پیدا ہوئیں، چونکہ منصور پہلے ان کی جماعت میں شریک رہا تھا اور ان کا رازدار اور ان کے منصوبوں سے اچھی طرح واقف تھا اس لیے ان کی طرف سے اس کو ہر وقت خطرہ تھا۔

نفس زکیہ

اہل بیت میں سے محمد بن عبداللہ جو نفس زکیہ کے لقب سے مشہور تھے اپنی خلافت کے لیے بہت کوشاں تھے۔ بنی امیہ کے آخری خلیفہ مروان کے زمانے میں اکثر رؤسا بنی ہاشم نے ان کی امامت کی بیعت کی تھی اور ان کو مہدی تسلیم کیا تھا۔ اس بیعت میں سفّاح اور منصور بھی شامل تھے۔ اس وجہ سے جب عبّاسیوں نے خلافت قائم کی تو نفس زکیّہ نے سفّاح

کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی۔ اور چاہا کہ خود اپنی خلافت کا اعلان کریں لیکن سفّاح ان کے والد اور چچا کے ساتھ سلوک کرتا تھا اس لیے اس کے زمانے میں خاموش رہے۔ نفس زکیہ کے دوسرے بھائی ابراہیم بن عبداللہ تھے جن کو خراسان کی ایک جماعت امام مانتی تھی اور ان کی حمایت کے لیے تیار تھی۔

سفّاح کے بعد جب منصور خلیفہ ہوا تو چونکہ اس کو ان دونوں بھائیوں کے ارادے معلوم تھے اس لیے ان کی طرف سے بہت بدگمان تھا نفس زکیہ کا مرکز مدینہ منورہ تھا اور وہ اردگرد کے قبائل میں روپوش رہتے تھے منصور وہاں کے عاملوں کو سخت تاکید لکھتا تھا کہ ان کا پتہ لگائیں مگر وہ قاصر رہے۔ آخر اس نے رباح کو وہاں کا عامل بنا کر بھیجا۔ اس کو معلوم ہوا کہ وہ مدینے میں چھپ چھپ کر اپنی جماعت میں آتے ہیں اس لیے اس نے بنی حسن میں سے ۱۳ آدمیوں کو پکڑ کر منصور کے پاس بھیج دیا۔ اس نے ان پر ایسی سختیاں کیں کہ ان میں سے اکثر ہلاک ہو گئے۔

اب نفس زکیہ کو اپنے خاندان پر یہ مظالم دیکھ کر تاب ضبط نہ رہی یکم رجب ۱۴۵ھ کو مدینے میں داخل ہوئے۔ رباح کو گرفتار کر کے شہر پر قبضہ کر لیا منصور کو جب اطلاع ہوئی تو اس نے پہلے کوفہ کو محصور کر دیا تاکہ شیعہ کا تعلق ان سے منقطع رہے پھر ان کو لکھا:

> از جانب ابو جعفر عبداللہ بن محمد (منصور) امیر المومنین، بنام محمد بن عبداللہ (نفس زکیہ)
>
> قرآن میں اللہ نے فرمایا ہے کہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑیں اور دنیا میں فساد پھیلائیں ان کی سزا یہ ہے کہ مار ڈالے جائیں یا سولی پر چڑھا دیے جائیں یا ان کے ہاتھ پاؤں برخلاف کاٹ لیے جائیں یا ملک بدر کر دیے جائیں اس لیے میں اللہ اور اس کے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حق کا واسطہ دلا کر عہد و پیمان کرتا ہوں کہ اگر اس سے پہلے کہ میں تمہارے

اور پر قابو پاؤں تم توبہ کر لوگے تو میں تمہاری اور تمہارے تمام بھائیوں کی اور ساتھیوں کی اور معتقدوں کی جو اس بغاوت میں شریک ہیں جان بخشی کردوں گا۔ نیز دس لاکھ درہم تم کو دوں گا کہ جہاں چاہو رہو۔ اور تمہاری جو ضروریات ہوں گی ان کو پورا کرتا رہوں گا۔ تمہارے اہل بیت اور شیعہ میں سے جو لوگ میرے قید خانوں میں ہیں ان کو چھوڑ دوں گا اور کسی قسم کی تکلیف نہیں دوں گا۔ اگر اس پر تم راضی ہو تو اپنے کسی معتمد کو بھیج دو کہ آکر مجھ سے عہد نامہ لکھوالے۔

اس کے جواب میں نفس زکیہ نے لکھا:۔

از جانب محمد بن عبداللہ مہدی امیر المومنین بہ نام عبداللہ بن محمد میں بھی تمہارے لیے اسی قسم کی امان پیش کرتا ہوں جس قسم کی تم نے پیش کی ہے۔ تم جانتے ہو کہ خلافت ہمارا حق ہے اور ہمارے ہی شیعوں کی بدولت تم نے اس کو حاصل کیا ہے۔ ہمارے باپ حضرت علی کرم اللہ وجہہ وصی اور امام تھے ہم جو ان کے بیٹے ہیں، زندہ ہیں پھر ہمارے ہوتے ہوئے تم کیسے اس کے وارث بن گئے تمھیں یہ بھی خوب معلوم ہے کہ جاہلیت اور اسلام دونوں میں بنی ہاشم میں سے جو نسبی فضائل و مفاخر ہم کو حاصل ہیں وہ کسی کو حاصل نہیں ہو سکے۔ زمانۂ جاہلیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دادی فاطمہ بنت عمرو کے شکم سے ہم ہیں نہ کہ تم۔ خاص کر میں ہاشم کی اولاد میں نسب میں سب سے بہتر اور ماں باپ کے لحاظ سے سب سے بڑھ کر ہوں۔ میری رگوں میں امہات اولاد کا غیر عربی خون مطلق نہیں ہے۔ میرے نسب کو اللہ نے ہمیشہ ممتاز رکھا۔ دنیا میں سب سے افضل محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ میں ان کا بیٹا ہوں۔ صحابہ میں میرے باپ حضرت علی اسلام میں سب سے اول،

علم میں سب سے فائق اور جہاد میں سب سے افضل تھے۔ میری ماں حضرت خدیجہ ہیں جنھوں نے اس امت میں سب سے پہلے نماز پڑھی پھر حضرت فاطمہ ہیں جو ان کی بیٹیوں میں سب سے بہتر اور جنتی عورتوں کی سردار ہیں، زمانۂ اسلام میں ہاشم کے بہترین فرزند حضرت حسن اور حسین ہیں جو بہشتی جوانوں کے سردار ہیں۔ ان میں سے بڑے کا میں بیٹا ہوں۔ اب دیکھو حضرت علی والدین کی طرف سے ہاشم کے بیٹے ہیں۔ امام حسن والدین کی طرف سے عبدالمطلب کے بیٹے ہیں اور میں والدین کی طرف سے رسول اللہ کا بیٹا ہوں۔

اللہ نے ہمارا امتیاز ہمیشہ قائم رکھا۔ یہاں تک کہ جہنم میں بھی اس نے اس کا لحاظ کیا۔ یعنی میں اس شخص کا بیٹا ہوں جو جنت میں سب سے بڑا درجہ رکھتا ہے اور اس شخص کا بیٹا ہوں جو جہنم میں سب سے ہلکا عذاب پائے گا۔ اس طرح پر نیکیوں میں سب سے بہتر نیک اور گنہگاروں میں سب سے کمتر گنہگار کا فرزند ہوں۔

میں اللہ کو گواہ کر کے تم کو ہر چیز کی سوائے کسی شرعی حد یا کسی مسلم، یا معاہد کے حق کے جو تمھارے ذمہ ہو امان دیتا ہوں اور میں بہ نسبت تمھارے عہد کا زیادہ پابند ہوں۔ تم نے مجھ کو جو امان دی ہے وہ کون سی ہے؟ ابن ہبیرہ والی یا وہ جو تم نے اپنے چچا عبداللہ کو یا ابومسلم خراسانی کو دی تھی فقط"۔

کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ نسبی مفاخر جن کو رسول اللہؐ نے نخوت جاہلیت قرار دے کر فتح مکہ کے دن پاؤں سے روند ڈالا اور جن کو قرآن نے مٹا کر سارے مسلمانوں کو آپس میں بھائی بھائی بنا دیا انھیں کو یہ ائمہ اپنی امامت اور حق خلافت کے ثبوت میں کس کس طرح پیش کرتے تھے۔ درحقیقت ان کے مقاصد شخصی تھے نہ کہ جمہوری۔

منصور کے پاس جب یہ خط پہنچا تو اس کے کاتب نے جواب لکھنے کی اجازت

مانگی منصور نے کہا کہ یہ تمھارا کام نہیں ہے۔ جب حسب نسب اور خاندان کے جھگڑے آ پڑے تو خود مجھے جواب لکھنا چاہیئے۔ اس نے لکھا :-

از ابوجعفر عبداللہ بن محمد امیر المومنین بنام محمد بن عبداللہ

تمھارا خط مجھ کو ملا۔ عوام کو برانگیختہ کرنے اور جہلا میں مقبول بننے کے لیے تم نے یہ نسبی مفاخر جوڑ رکھے ہیں جن کی ساری بنیاد عورتوں پر ہے۔ حالاں کہ عورتوں کا وہ درجہ نہیں ہے جو چچا کا ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ اللہ نے جس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اس وقت ان کے چچاؤں میں سے چار شخص زندہ تھے (حمزہ، عباس، ابوطالب اور ابولہب) ان میں سے دو اسلام لائے جن میں سے ایک میرا باپ تھا۔ اور دو کافر رہے جن میں سے ایک تمھارا باپ تھا۔ تم نے عورتوں کا ذکر کر کے ان کی قرابت پر جو فخر کیا ہے یہ نادانی ہے۔ اگر عورتوں کو نسبی فضیلت میں سے کوئی حصہ ملتا تو ساری فضیلت رسول اللہ کی والدہ کے لیے ہوتی لیکن اللہ تو جس کو چاہتا ہے اپنے دین سے سربلند کرتا ہے

تعجب ہے کہ ابوطالب کی والدہ فاطمہ بنت عمرو پر بھی تم نے فخر کیا ہے سوچو تو کہ ان کے بیٹوں میں سے کسی کو بھی اللہ نے اسلام کی ہدایت کی اور اگر کرتا تو اس کے زیادہ حقدار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے والد ہو سکتے تھے لیکن وہ تو جس کو چاہتا ہے اسی کو ہدایت دیتا ہے۔

تم نے اس پر بھی فخر کیا ہے کہ حضرت علی والدین کی طرف سے ہاشمی ہیں اور حسنؓ والدین کی طرف سے عبدالمطلب کے بیٹے ہیں اور تمھارا نسب والدین کی طرف سے رسول اللہ تک پہنچتا ہے۔ اگر یہ واقعی کوئی فضیلت ہوتی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے زیادہ مستحق ہوتے لیکن وہ

تو صرف ایک ہی طرف سے ہاشمی ہیں۔

پھر تم اپنے آپ کو رسول اللہ کا بیٹا کہتے ہو حالاں کہ قرآن نے اس سے بالکل انکار کیا ہے۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ | محمد تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہ تھے

ہاں تمھارا یہ کہنا درست ہے کہ تم ان کی بیٹی کی اولاد ہو اور یہ بے شک ایک قریبی رشتہ ہے لیکن اس کے ذریعے سے کسی قسم کی میراث نہیں مل سکتی اور نہ اس سے تم امامت کے حقدار ہو سکتے ہو۔ اسی قرابت کی بنیاد پر تمھارے باپ حضرت علی نے ہر طرح پر خلافت حاصل کرنے کی کوشش کی حضرت فاطمہ کو ابوبکر رض سے لڑا کر رنجیدہ کرایا۔ اسی غصہ میں ان کی بیماری کی بھی کسی کو اطلاع نہیں کی اور جب انھوں نے انتقال فرمایا تو رات ہی کو لے جا کر ان کو دفن کر دیا۔ مگر کوئی ابوبکر کو چھوڑ کر ان کی خلافت پر راضی نہ ہوا۔ خود آنحضرت کی بیماری کے زمانے میں بھی وہ موجود تھے۔ لیکن نماز پڑھانے کا حکم آپ نے ابوبکر کو دیا۔ ان کے بعد حضرت عمر خلیفہ ہو گئے۔ پھر خلافت اصحاب شوریٰ میں آئی۔ اس میں بھی وہ انتخاب میں نہ آسکے اور حضرت عثمان خلیفہ ہو گئے۔ ان کے بعد انھوں نے طلحہ رض و زبیر رض پر سختی کی۔ سعد بن وقاص سے بیعت لینی چاہی انھوں نے اپنا پھاٹک بند کر لیا۔ جب علی گزر گئے امام حسن ان کی جگہ پر آئے۔ معاویہ نے شام سے لشکر کشی کی نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ رقم ان سے لے کر اپنے شیعہ اور خلافت دونوں کو معاویہ کے سپرد کر دیا اور مدینے چلے گئے۔ لہٰذا اگر تمھارا کچھ حق بھی تھا تم اس کو فروخت کر چکے۔

تمھارا یہ کہنا کہ اللہ نے جہنم میں بھی تمھارے امتیاز کا لحاظ رکھا کہ تمھارے باپ ابوطالب کو اس میں سب سے کمتر عذاب ملے گا۔ نہایت افسوسناک

ہے۔ اللہ کا عذاب خواہ کم ہو یا زیادہ مسلمان کے لیے فخر کی چیز نہیں ہے اور نہ اس میں کوئی فضیلت ہے۔

یہ جو تم نے لکھا ہے کہ تمھاری رگوں میں عجمی خون مطلق نہیں ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تم آنحضرتؐ کے فرزند ابراہیم سے بھی بڑھ کر اپنے آپ کو سمجھتے ہو۔ حالانکہ وہ ہر لحاظ سے تم سے افضل تھے۔ خود تمھارے خاندان میں زین العابدین تھے وہ تمھارے دادا حسن بن حسن سے بہتر تھے۔ پھر ان کے بیٹے محمد باقر تمھارے باپ سے بہتر اور ان کے بیٹے جعفر صادق تم سے بہتر ہیں حالاں کہ ان سب کی رگوں میں عجمی خون ہے۔

تم یہ بھی دعوے کرتے ہو کہ نسب اور ماں باپ کے لحاظ سے تم کل بنی ہاشم سے بہتر ہو۔ بنی ہاشم میں سے رسول اللہ بھی ہیں تمھیں یہ تو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ قیامت کے دن اللہ کو منہ دکھانا ہے۔

صفین کے معاملے میں تمھارے باپ حضرت علی نے پنچوں سے پیمان کیا تھا کہ ان کے فیصلے پر رضامند ہو جائیں گے۔ تم نے یہ سنا ہوگا کہ پنچوں نے ان کو خلافت سے معزول کر دیا تھا۔ یزید کے عہد میں تمھارے عم حسین بن علی ابن زیاد کے مقابلے کے لیے کوفہ میں آئے اور جو لوگ ان کے حامی تھے انھیں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ ان کے بعد تمھارے خاندان کے کئی آدمی یکے بعد دیگرے خلافت لینے کے لیے اٹھے۔ بنی اُمیّہ نے ان کو قتل کیا اور سولی پر چڑھایا۔ یہاں تک کہ ہم مستعد ہوئے اور ہم نے تمھارا اور اپنا سب کا انتقام ان سے لیا۔ وہ نماز کے بعد تمھارے اوپر جو لعنتیں بھیجا کرتے تھے اس کو بند کیا۔ تمھارے رتبے بڑھائے۔ اب انھیں امور کو تم ہمارے سامنے بطور حجّت کے پیش کرتے ہو۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے حضرت علی کی

فضیلت کا جو اظہار کیا ہے تو ہم ان کو عباس و حمزہ (رضی اللہ عنہما) سے بھی بڑھ کر تسلیم کرتے ہیں؟ وہ سب لوگ محفوظ گزر گئے اور حضرت علی ان جنگوں میں پڑے جن میں مسلمانوں کی خونریزی ہوئی ۔

تمھیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ زمانۂ جاہلیت میں سقایتہ حاج اور زمزم کے متولی حضرت عباس تھے نہ کہ ابو طالب ۔ حضرت عمر کی عدالت میں تمھارے باپ نے اس کا دعویٰ بھی پیش کیا مگر فیصلہ ہمارے حق میں ہوا ۔

رسول اللہ صلعم نے جس وقت وفات پائی اس وقت ان کے اعمام میں سے سوائے حضرت عباس کے اور کوئی زندہ نہ تھا ۔ اس لیے کل اولاد عبدالمطلب میں سے آنحضرت صلعم کے وارث وہی ہیں ۔ پھر بنی ہاشم میں سے بہت لوگ خلافت حاصل کرنے کے لیے اُٹھے لیکن بنی عباس ہی نے اس کو حاصل کیا لہٰذا قدیم استحقاق اور جدید کامیابی حضرت عباس اور ان کی اولاد ہی کے حصّہ میں آئی ۔

بدر کی لڑائی میں تمھارے چچا طالب اور عقیل کی وجہ سے مجبوراً حضرت عباس کو بھی آنا پڑا ۔ ورنہ وہ دونوں بھوکوں مرجاتے یا عتبہ اور شیبہ کے پیالے چاٹتے ۔ ہمارے ہی باپ کی بدولت اس ننگ و عار سے بچے ۔ نیز آغاز اسلام میں قحط کے زمانے میں حضرت عباس ہی نے ابو طالب کی امداد کی ۔ پھر تمھارے چچا عقیل کا فدیہ بھی بدر میں انھوں نے ہی ادا کیا ۔ الغرض جاہلیت اور اسلام دونوں میں ہمارے احسانات تمھارے اوپر ہیں ۔ ہمارے باپ نے تمھارے باپ پر احسان کیے اور ہم نے تمھارے اوپر ۔ اور جن رتبوں پر تم خود اپنے آپ کو نہیں پہنچا سکے تھے ان پر ہم نے تم کو پہنچایا اور جو انتقام تم نہیں لے سکے تھے وہ ہم نے لیے والسلام ۔

ان خطوط کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ حکومت الٰہی کا تصور دماغوں سے کس قدر بعید ہو چکا تھا کہ ابوجعفر منصور جیسا اہل سنّت کا عظیم الشان خلیفہ اور نفس زکیہ جیسا اہل بیت کا مہاری تسلیم کیا ہوا امام اس کو وراثتی تسلیم کر رہے ہیں صرف جھگڑا یہ ہے کہ یہ وراثت بیٹی کی اولاد کو پہنچتی ہے یا چچا کی[۱]

اس خط و کتابت کے بعد جس میں بجز فخر و مباہات اور خاندانی طعنے اور تشنے کے سوا اور کچھ نہ تھا منصور نے عیسیٰ بن موسیٰ ولی عہد کو فوج دے کر مدینے کی طرف بھیجا۔ نفس زکیہ نے مقابلہ کیا۔ مارے گئے اور ۱۴ رمضان ۱۴۵ھ میں ان کا سر کاٹ کر بغداد بھیجا گیا۔ نفس زکیہ کے بھائی ابراہیم بصرہ میں تھے چند روز کے بعد انھوں نے بھی اپنی امامت کا جھنڈا بلند کیا اور بصرے سے اہواز تک قبضہ کر لیا۔ عیسیٰ مدینے کی مہم سے فارغ ہو کر منصور کے حکم سے ان کی طرف آیا۔ ۲۵ ذیقعدہ ۱۴۵ھ کو ان کا سر بھی کاٹ کر منصور کے پاس بھیج دیا۔

امام مالک و ابوحنیفہ

نفس زکیہ اور ابراہیم دونوں بھائی آل علی میں شجاعت، تقوے اور علم و عمل میں ممتاز تھے۔ لیکن تقدیر نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ مالک نے مدینے میں نفس زکیہ کی حمایت کا فتوے دیا تھا۔ عباسیوں نے ان کو کوڑوں سے پٹوایا۔ اور

۱؎ اسی قسم کی ایک بحث خلیفہ مامون الرشید اور امام علی رضا کی عیون الاخبار میں منقول ہے۔ مامون نے امام موصوف سے پوچھا کہ تم کس بنیاد پر خلافت کا دعویٰ کرتے ہو۔ بولے کہ رسول اللہ ؐ سے حضرت علی اور فاطمہ کی قربت پر۔ مامون نے کہا کہ اگر حضرت علی کی قرابت کی بنیاد پر یہ دعویٰ ہے تو آنحضرت ؐ نے ایسے ورثہ چھوڑے تھے جن میں سے بعض ان سے بھی زیادہ قریبی اور بعض انھیں کے درجہ کے تھے اور اگر فاطمہ کے رشتہ کی بنیاد پر ہے تو ان کے بعد اس کے حقدار حسن اور حسین تھے۔ ان کی موجودگی میں حضرت علی نے خلافت پر قبضہ کر کے ان کا حق کیوں غصب کیا۔ امام علی رضا نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔

عراق میں امام ابوحنیفہ ابراہیم کے طرفدار تھے منصور نے ان کو بغداد میں قید کر دیا۔ اسی قید میں ۱۵۰ھ میں انھوں نے وفات پائی۔

ان دونوں اماموں کی یہ نصرت و حمایت جہاں تک سمجھ میں آتا ہے صرف اس وجہ سے تھی کہ عباسیوں کے استبداد سے مسلمانوں کو کسی طرح نجات مل جائے۔ چنانچہ پہلے جب بنی امیہ کی شخصی حکومت اور ان کے مظالم سے لوگ تنگ تھے اس وقت بھی ۱۲۲ھ میں ہشام بن عبدالملک کے مقابلے میں امام زید کی ابوحنیفہ نے مدد کی تھی اور چار ہزار درہم ان کے پاس بھیجے تھے۔

انقلاب حکومت کے بعد عباسیوں سے جیسا کہ انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ کتاب و سنت کے مطابق عمل کریں گے امید تھی کہ امت کو فلاح نصیب ہو گی لیکن ان کا استبداد بنی امیہ سے بھی زیادہ سخت نکلا۔ اس لیے جب نفس زکیہ اور ابراہیم نے ان کے خلاف خروج کیا تو ان دونوں اماموں نے ان کی حمایت کی۔ اس سے یہ نہیں خیال کیا جا سکتا کہ یہ حضرات نسبی یا خاندانی بنیاد پر کسی کو امامت کا حقدار سمجھتے تھے۔ بلکہ صرف یہ کہ ان کے زہد و تقویٰ کی وجہ سے ان سے بمقابلہ عباسیوں کے امت کی بہتری کی امید رکھتے تھے۔

منصور کے بعد

عباسیوں نے چونکہ قرابت رسول کے دعوے پر حکومت حاصل کی تھی اور علویہ ان سے زیادہ اقرب تھے اس وجہ سے ان کو ہر وقت ان کی طرف سے خطرہ رہتا تھا۔ چنانچہ منصور کے بعد بھی اہل بیت پر سخت نگرانی رکھی جاتی تھی۔ مہدی نے ایک علوی کو اپنے وزیر یعقوب بن داؤد کے حوالہ کیا کہ اس کو قتل کر دو مگر اس نے رات کو اس کو چھوڑ دیا اس جرم پر اس کو ایک کنویں میں قید کر دیا جس میں وہ پندرہ سال تک رہا، یہاں تک کہ اس کی بینائی جاتی رہی۔ ہادی کے زمانہ میں حسین بن علی نے جو امام حسن کی اولاد میں سے تھے مقام فخ میں خروج کیا۔ بغدادی فوج نے پہنچ کر ان کا سر کاٹ لیا اور دربار میں بھیجا۔ ہارون الرشید

کے عہد میں امام یحییٰ اور موسیٰ دونوں اس کے قید خانے میں مرے۔ جن کے متعلق مورخوں کے شبہات ہیں کہ اسی کے حکم سے ہلاک کیے گئے۔ برمکیوں کو بھی اس نے اسی جرم میں تباہ کیا کہ اس کو شبہ ہو گیا تھا کہ یہ آلِ علی کے طرفدار ہیں۔ رشید اور نیز متوکل کے یہاں سے کسی کو مال یا عطیہ نہیں ملتا تھا جب تک کہ وہ آلِ ابی طالب کو بُرا نہ کہے۔ ان کے درباروں میں مروان بن حفصہ اور عبدالملک اصمعی جیسے ناصبیوں کی قدر تھی۔ اور عبداللہ بن عمّار برقی جیسے لوگ جو حضرت علی کی منقبت میں شعر کہدیں ان کی زبان کاٹ لی جاتی تھی۔ الغرض عباسیوں کے ہاتھوں اہلِ بیت پر ایسے مظالم ہوئے کہ اب بنی امیہ کے عہد کو وہ جنت خیال کرنے لگے۔ ان کے شاعر نے کہا۔

یا لیت جور بنی مروان عاد لنا	یا لیت عدل بنی العباس فی النار
کاش بنی مروان کا ظلم پھر واپس آجاتا	اور بنی عباس کا عادل جہنّم رسید ہوتا

آغانی میں ہے کہ ابو عدی شاعر نے منصور کے عہد میں بنی امیّہ کا مرثیہ لکھا۔ جب علویہ کو سنایا تو نفس زکیہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ان کے چچا نے کہا کہ بنی امیہ تو ہمارے دشمن تھے ان پر تم کیوں روتے ہو۔ بولے کہ بے شک ہم ان سے بیزار تھے مگر ان میں پھر بھی مکارمِ اخلاق اور اعلیٰ صفات تھے۔ یہ عباسی تو ان سے بھی کم اللہ سے ڈرتے ہیں۔

مجھے ڈر ہے کہ میرے وہ بھائی جو تاریخی شخصیتوں سے عقیدت رکھتے ہیں یہ نہ کہنے لگیں کہ یہ گزشتہ خلفاء کی فردِ جرم ہے۔ میرا ہرگز یہ مقصود نہیں ہے۔ میں تو صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ حکومتِ الٰہی کی مقدس امانت جو رسول اللہ نے امت کے سپرد کی تھی اور خلفاءِ راشدین کے توسط سے اس کو ملی تھی اگر قائم رہتی تو نہ یہ مظالم ہوتے نہ خاندانی رقابتیں پیدا ہوتیں۔ یہ سب کچھ نتیجہ ہے اس کا کہ مستبد خلفاء نے اس کو انسانی حکومت میں تبدیل کر دیا تھا اور اپنے خاندان میں محدود رکھنا چاہتے تھے جس کے باعث ہر وہ فعل جو ان کے اس مقصد کے خلاف ہوتا جرم ٹھہرتا۔ اسی لیے ان کی چند ایسی سختیاں دکھانی ناگزیر تھیں

جو انھوں نے سلطنت کو اپنے خاندان میں محفوظ رکھنے کے لیے کیں۔ ان کے دیگر مظالم کا ذکر میں نے قصداً چھوڑ دیا کہ یہاں اس کا موقع نہ تھا۔ اکثر مسلمان مورخوں نے اموی اور عباسی خلفا کے کارناموں کو فخر کے ساتھ بیان کیا ہے بلکہ ان میں سے بعض کو بطل (ہیرو) بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ لوگ اسلامی خلافت کے صحیح مفہوم اور اس کے حقیقی رتبے سے واقف نہیں تھے اور اس کو بھی بادشاہت ہی سمجھتے تھے۔ اس لیے دوسری قوموں کے بادشاہوں کے مقابلے میں ان کی برتری دکھانے کی کوشش کی اور اس کو اسلام کی خدمت سمجھے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ شہنشاہیت کے لحاظ سے عبدالملک اور ولید یا منصور اور ہارون وغیرہ سے بہتر بادشاہ کون سی قوم پیش کر سکتی ہے مگر اسلام تو ابوبکر و عمر جیسے خلیفہ چاہتا ہے جو امت کو قرآن کے مطابق چلائیں اور صاف صاف کہتے رہیں کہ ہم میں جو غلطی دیکھو اس کی اصلاح کرو۔

نظام سلطنت

جس وقت عباسیوں نے بنی اُمیہ سے خلافت حاصل کی اس وقت اس کا مفہوم ہی بدل چکا تھا اور سوائے شخصی سلطنت کے حکومت الٰہی کا خیال تک بھی دلوں میں نہیں تھا اس لیے ان کا نظام بھی وہی رہا جو بنی امیہ کا تھا۔ ولی عہدی کا بھی طریقہ وہی رکھا گیا جو بنی امیہ نے اختیار کیا تھا۔ یعنی اپنے عزیزوں اور بیشتر اپنے بیٹوں کو ولی عہد بناتے تھے۔ بلکہ اکثر ایک کے بجائے دو دو اور تین تین ولی عہد مقرر کرتے تھے جن پر علما، صلحا، امرا، وزرا، حکام اور قضاۃ وغیرہ کے علاوہ اللہ، رسول، ملائکہ بلکہ جن بھی گواہ بنائے جاتے تھے تاکہ یہ جائداد خاندان ہی میں محفوظ رہے۔ لیکن بعد میں نزاعیں واقع ہوتی تھیں اور اُمّت میں فساد بڑھتا تھا کیونکہ عہد کا احترام انھوں نے خود اپنی مثالوں سے اُٹھا دیا تھا۔

یہ بھی صرف ایک صدی تک رہا جب تک کہ ان میں قوت تھی۔ جب ترکوں کا

غلبہ ہوگیا تو خلفاء کا عزل ونصب ان کے ہاتھ میں آگیا۔ پھر بنی بویہ اور سلجوق کے زمانوں میں تو کل اختیارات سلاطین کے ہاتھوں میں تھے۔ خلفاء صرف نام کے لیے رکھے جاتے تھے۔ عباسیوں نے بھی بنی امیہ کی طرح ملک، فوج اور خزانے پر قبضہ کے سوا امت کی دینی قیادت کبھی نہیں کی بلکہ اس کو علما ہی کے ہاتھوں میں چھوڑے رکھا۔ چونکہ ان کے عہد میں علوم دخیلہ مسلمانوں میں آئے تھے جن کا اثر خیالات اور عقائد پر بھی پڑا اس وجہ سے نئی نئی مذہبی بحثیں چھڑیں اور اختلافات بہت بڑھ گئے۔ مامون الرشید نے ان کو مٹانے کی کوشش شروع کی لیکن دین پر قبضہ علماء کا ہوچکا تھا اس کو عقلیت (اعتزال) کے دروازے سے داخل ہونا پڑا اور سخت ناکام ہوا۔

بنی امیہ کے عہد میں عربی حکومت اور سادہ زندگی ہونے کے باعث سلطنت کے لیے کسی خاص قانون کی ضرورت نہیں پڑی لیکن بنی عباس نے ایک مرکزی قانون کی ضرورت محسوس کی جس پر سب چلائے جائیں۔ ابن المقفع نے خلیفہ منصور کے سامنے حکمرانی کے متعلق جو تجاویز پیش کی تھیں ان میں بھی اس بات پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا تھا کہ اجماعی اور متفق علیہ نصوص کے مطابق ایک ایسا قانون بنایا جائے جس سے جمہور اور قضاۃ سب واقف ہوں۔ پھر زمانے کی ضروریات کے مطابق اس کی اصلاح و ترمیم ہوتی رہے۔ منصور نے امام مالک سے درخواست کی کہ موطا[۱] کو سلطنت کا قانون عام

---

[۱] امام مالک کی موطا خیر القرون کے عمل متواتر کا جملہ دینی کتب سے زیادہ اعتماد کے قابل مجموعہ ہے کیونکہ مدینہ منورہ عہد رسالت وخلافت راشدہ میں اسلام کا مرکز رہا۔ اس میں علماء تاریخ کے اندازہ کے مطابق کم وبیش بارہ ہزار صحابہ تھے جن میں سے تقریباً دس ہزار وہیں رہے اور وہیں فوت ہوئے۔ بقیہ دو ہزار عراق، مصر، شام اور یمن وغیرہ میں پھیلے۔ اس لیے شریعت کا اصل اور صحیح ذخیرہ مدینے ہی میں ہوسکتا تھا۔ یہ خوش قسمتی ہے کہ آج ہمارے ہاتھوں میں جس قدر دینی کتابیں ہیں ان میں سب سے پہلی کتاب جو مدوّن ہوئی وہ مدینے میں ہوئی یعنی یہی موطا۔ اس میں اہل مدینہ کے پاس اسوۂ رسول وخلفاً راشدین وصحابۂ کرام وتابعین عظام کا جو کچھ سرمایہ تھا اور جس قدر رسائل اور نتادے ان کے معمول بہ تھے وہ سب جمع کردیے گئے ہیں یہ کتاب صحیح بخاری سے سو سال پہلے لکھی گئی ہے۔

قرار دیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ مختلف حصوں میں لوگوں کا عمل مختلف طریقوں پر رائج ہو چکا ہے۔ بولا کہ کیا مضائقہ ہے ہم بزور ان کو اس کے اوپر چلائیں گے مگر وہ راضی نہ ہوئے۔ پھر ہارون الرشید نے بھی اپنے زمانے میں ان سے یہی درخواست کی مگر انھوں نے قبول نہیں کیا۔ آخر امام ابو یوسف جو امام ابو حنیفہ کے شاگرد رشید تھے بغداد کے قاضی مقرر کیے گئے انھوں نے رفتہ رفتہ حنفی کو عباسی سلطنت کا قانون عام بنا دیا۔

عباسی خلافت کی مدّت چوں کہ بہت طویل ہوئی اور بغداد کا علمی اور دینی اثر امّت پر غالب رہا اس وجہ سے رسماً اور تقلیداً یہ عقیدہ دلوں میں راسخ ہو گیا کہ خلافت کا حق صرف بنی عباس کو ہے۔ ۲۹۵ھ میں فاطمیہ نے افریقہ میں اپنی خلافت کا دعویٰ کیا۔ یہ دیکھ کر سنہ ۳ھ میں عبدالرحمٰن ناصر نے اندلس میں اپنی خلافت کا جھنڈا بلند کر دیا مگر بالعموم امّت عباسی ہی خلافت کو باوجود اس کی تمام کمزوریوں کے صحیح اور جائز سمجھتی رہی اور خود مختار سلاطین خلیفہ عباسی ہی سے فرمانروائی کی سند حاصل کرتے تھے۔ اسی عقیدے کی بنا پر زوال بغداد کے بعد مصر میں عباسی خلافت قائم کر دی گئی جو اگرچہ وہاں کے سلاطین کے ہاتھوں میں تھی مگر اسلامی ممالک کے تاجداروں کو حکومت کی سند دیتی تھی۔ صحیح مرکز کا تصوّر نہ سلاطین کے دماغوں میں تھا نہ علما کے۔

خوارج

اس جماعت کا آغاز جنگ صفین میں واقعۂ تحکیم سے ہوا۔ امیر معاویہ نے جب شکست محسوس کی اس وقت ان کے حکم سے شامیوں نے نیزوں پر قرآن بلند کیے اور عراقی فوجوں سے پکار کر کہنے لگے کہ ہمارے اور تمھارے درمیان کتاب اللہ ہے۔ اگر تم فنا ہو گئے تو مشرقی سرحدوں کی حفاظت کون کرے گا اور اگر ہم مٹ گئے تو مغربی حملوں کی مدافعت کے لیے لوگ کہاں سے آئیں گے۔ سادہ دل عراقیوں نے یہ دیکھ کر لڑائی سے ہاتھ روک لیا اور بولے کہ ہم کو کتاب اللہ کا فیصلہ منظور ہے۔ حضرت علی نے کہا کہ اللہ کے بندو! تم حق پر ہو اپنے ہاتھ نہ روکو فتح میں اب دیر نہیں ہے۔ مگر وہ کہنے لگے کہ ہم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی کتاب اللہ کی طرف بلائے اور ہم انکار کر دیں۔ مسعر ابن فدکی اور اس کے ساتھیوں نے تو یہاں تک کہا کہ آپ کتاب اللہ کے فیصلہ کو منظور کریں نہیں تو ہم ساتھ چھوڑ دیں گے۔ مجبوراً حضرت علی کو لڑائی بند کر کے تحکیم پر راضی ہونا پڑا۔

لیکن عراقی فوج کی ایک جماعت نے مخالفت کی اور کہا کہ حکم الٰہی میں تم نے انسانوں کو کیوں ثالث مانا۔ ہم سوائے اللہ کے کسی کا حکم نہیں مانیں گے۔ چنانچہ ثالثی نامہ لکھے جانے کے بعد حضرت علی اپنی فوج لے کر جب واپس چلے تو راستے بھر ان میں جھگڑے ہوتے رہے کوفہ کے قریب پہنچ کر اس میں سے بارہ ہزار آدمی الگ ہو گئے اور مقام حرورا میں جا کر خیمے ڈال دیے۔

حضرت علی نے پہلے حضرت عبداللہ بن عباس کو ان کی فہمائش کے لیے بھیجا پھر خود بھی پہنچ گئے اور پوچھا کہ تم لوگ ہماری جماعت سے کیوں الگ ہوئے۔ خوارج نے کہا اس لیے کہ آپ نے اللہ کے حکم میں انسانوں کو ثالث بنایا۔ حضرت علی نے جواب

دیا کہ میں نے تو پہلے ہی اس کے قبول کرنے سے منع کیا تھا مگر تم لوگوں نے خود اصرار کر کے مجھے مجبور کر دیا۔ علاوہ بریں یہ شرط لکھی گئی ہے کہ ثالث قرآن کے مطابق فیصلہ کریں گے لہذا قرآن پر چلنے میں کیا قباحت ہے۔ خوارج بولے کہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ اس معاملے میں ہمارا ثالثی قبول کرنا کفر تھا اور ہم اس کفر سے توبہ کرتے ہیں۔ آپ بھی اگر تائب ہو جائیں تو ہم آپ کے ساتھ ہیں۔

ان کے نظریہ کی توضیح یہ ہے کہ حضرت علی خلیفہ برحق تھے۔ ان کی بیعت واجب تھی جن لوگوں نے اس سے انکار کیا اور مقابلے کے لیے آئے وہ اللہ و رسولؐ سے باغی ہیں جن کے لیے قرآن میں قتل کا حکم ہے۔ اس لیے معاویہ کی جماعت از روئے قرآن واجب القتل ہے۔ لہذا اللہ کا حکم موجود ہوتے ہوئے ان کے ساتھ مصالحت کرنے اور ان کے معاملے میں اشخاص کو ثالث بنانے کے کیا معنے۔ اور چونکہ حضرت علی اس جرم کے مرتکب ہوئے کہ انھوں نے قرآنی حکم میں اشخاص کو ثالث بنایا اس لیے ان کی خلافت ناجائز ہے۔

اس وقت حضرت علی کے کہنے سے وہ واپس آ گئے۔ غالباً انھوں نے خیال کیا کہ تحکیم کو جو ہم نے کفر سمجھا ہے اس میں حضرت علی بھی ہمارے ہم خیال ہیں، لیکن فیصلہ ثالثی کے وقت جب حضرت علی نے ابوموسیٰ اشعری کو چار سو آدمیوں کے ہمراہ دومۃ الجندل کی طرف روانہ کیا تو خوارج مخالفت کے لیے کھڑے ہو گئے۔ عبداللہ بن وہب راسبی کے مکان پر جمع ہو کر اس کو اپنا امیر بنایا اور طے کیا کہ اس شہر کو جہاں کے باشندے ظالم ہیں چھوڑ کر باہر نکل جانا اور امر بالمعروف کرنا چاہیئے۔

یا تو اس خروج یا امام کی اطاعت سے خروج کی وجہ سے یہ جماعت خارجی کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ لوگ کوفہ سے نکل کر جسر نہروان پر جمع ہوئے۔ وہاں سے بصرہ وغیرہ دوسرے مقامات میں بھی اپنے خروج کی اطلاع بھیجی۔

ثالثوں نے حضرت علی کو خلافت سے معزول کیا حضرت علی نے اس کو قرآن کے خلاف قرار دے کر کوفیوں کو حکم دیا کہ شام کی روانگی کے لیے تیار ہو جائیں۔ خوارج کو بھی لکھا کہ آکر جماعت میں شامل ہو جاؤ۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم آپ کو امام نہیں مانتے اس لیے ان کی طرف سے مایوسی ہوگئی۔ چاہا کہ ان کے حال پر چھوڑ کر شام کی طرف لشکر کشی کریں۔ باہر نکل کر نخیلہ میں خیمہ زن ہوئے وہاں خبر ملی کہ خوارج لوگوں کو اس فوج میں شریک ہونے سے روکتے ہیں اور کبھی آدمیوں کو انھوں نے قتل بھی کر ڈالا ہے۔ حضرت علی نے ان کے پاس قاصد بھیجا اس کو بھی مار ڈالا۔ امرا فوج نے کہا کہ اگر ان کو یہاں چھوڑ کر ہم شام کی طرف روانہ ہو جائیں گے تو یہ ہمارے گھروں کو لوٹ لیں گے۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ پہلے ان کا فیصلہ کر دیا جائے۔ حضرت علی نے ان کی رائے کو مناسب سمجھ کر اسی طرف رخ کیا۔ وہاں پہنچ کر ان سے کہا کہ تمھاری جماعت کے جن لوگوں نے ہمارے آدمیوں کو قتل کیا ہے ان کو ہمارے سپرد کر دو۔ اس پر خارجی یک زبان ہو کر بولے کہ ہم سب نے ان کو قتل کیا ہے اور ہم سب ان کے خون کو حلال سمجھتے ہیں۔ حضرت علی نے ہر چند ان کو نصیحت کی مگر کچھ اثر نہ ہوا۔ آخر حضرت ابوایوب انصاری کو حکم دیا کہ امان کا جھنڈا لے کر کھڑے ہو جائیں پھر اعلان کرا دیا کہ سوائے ان لوگوں کے جنھوں نے ہمارے آدمیوں کو قتل کیا ہے جو شخص اس جھنڈے کے نیچے آجائے گا یا کوفہ وغیرہ کسی آبادی کی طرف چلا جائے گا اس کو امان ہے۔ خارجیوں میں سے بہت سے لوگ جھنڈے کے نیچے آگئے اور کچھ کوفہ میں داخل ہو گئے۔ ابن وہب کے ساتھ صرف ۲۸۰۰ آدمی رہ گئے۔ ان سے جنگ ہوئی جس میں تقریباً وہ سب کے سب مارے گئے۔ چار سو زخمی جو میدان جنگ میں پڑے تھے ان کو حضرت علی نے اٹھوا کر ان کے رشتہ داروں کے سپرد کیا کہ کوفہ میں لے جا کر علاج کرائیں۔

اس کے بعد حضرت علیؓ نے شام کی روانگی کی تیاری شروع کی اور اہل کوفہ کو چلنے کا حکم دیا۔ روزانہ پرجوش خطبے سنا سنا کر جہاد کے لیے ان کو آمادہ کرتے مگر وہ اپنے

گھروں میں جا کر بیٹھ رہے۔ بالآخر مایوس ہو کر ان کو اس مہم کا ارادہ ترک کر دینا پڑا۔

خوارج پہلے ہی ان کی خلافت کا انکار کر چکے تھے۔ نہروان کی لڑائی نے ان کے دلوں میں ان کی طرف سے اور بھی نفرت پیدا کر دی۔ ان وجوہات سے انھیں میں سے ایک شخص عبدالرحمٰن بن ملجم مرادی نے جس کی بیوی کے بہت سے رشتہ دار نہروان میں مارے گئے تھے ان کو خنجر مارا جس سے وہ جاں بر نہ ہو سکے۔

خوارج اور امیر معاویہ

یہ جماعت جس نے ثالث ماننے پر حضرت علی کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ امیر معاویہ کی حکومت کو جو تغلب پر مبنی تھی کیونکر جائز سمجھتی۔ چنانچہ پوری قوت سے ان کے مقابلے کے لیے کھڑی ہو گئی۔ کوفہ میں امیر معاویہ کے ہاتھ پر بیعت ہوتے ہی فردہ بن نوفل اشجعی پانسو خارجیوں کے ساتھ علانیہ مخالفت کے لیے نکلا اور نخیلہ میں خیمہ زن ہوا۔ اس کے مقابلے کے لیے شامیوں کی فوج کا ایک دستہ آیا جو شکست کھا گیا۔ امیر معاویہ نے رؤسائے کوفہ سے کہا کہ یہ لوگ تمہارے ہی خاندان اور قبیلے کے ہیں جا کر ان کو سمجھاؤ کہ کیوں امت میں خونریزی کرتے ہیں۔ ان لوگوں نے جا کر بہت سمجھایا مگر وہ نہیں مانے اور کہنے لگے کہ معاویہ ہمارے اور تمہارے سب کے دشمن ہیں۔ ہم کو ان کے ساتھ لڑنے دو۔ اگر ہم نے شکست دے دی تو متفقہ دشمن تباہ ہوا نہیں تو ہم خود فنا ہو جائیں گے۔ قبیلہ اشجع نے فردہ کو پکڑ کر زبردستی باندھ لیا اور اپنے ساتھ کوفہ میں لائے۔ خوارج نے اس کی جگہ عبداللہ بن ابی الحوسا کو اپنا سردار بنا لیا۔ کوفیوں کے مقابلہ میں وہ مارا گیا۔ اب حوثرہ اسدی کو انھوں نے اپنا امیر بنایا۔ امیر معاویہ نے حوثرہ کے باپ سے کہا کہ جا کر اپنے بیٹے کو سمجھاؤ۔ وہ گئے مگر ان کی باتوں کا حوثرہ پر کچھ اثر نہ ہوا۔ بولے کہ اب میں تیرے بچے کو لاتا ہوں جب تو اس کو دیکھے گا تو اس کی محبت کی وجہ سے اس بغاوت سے باز آجائے گا۔ حوثرہ نے کہا کہ میں اپنے بچے کی بہ نسبت راہ حق میں اس نیزہ کی انی کا زیادہ شائق ہوں جو میرے جگر سے پار

ہو جائے اور جس کے زخم سے تڑپ تڑپ کر جان دیدوں۔ انھوں نے یہ کیفیت امیر معاویہ کو آکر سنائی۔ امیر معاویہ نے کوفہ سے ایک فوج گراں ان کے مقابلے کے لیے بھیجی۔ حوثرہ نے کہا کہ ظالمو! کل تک تم معاویہ کو باغی سمجھ کر ان کے خلاف جنگ کرتے تھے اور آج ان کی خلافت قائم کرنے کے لیے تلوار اٹھائی ہے۔ حوثرہ کے مقابلے میں خود اس کے باپ گئے اس نے ان کی طرف سے منہ موڑ کر دوسرے کوفیوں پر حملہ کیا۔ بنی طے کے ایک شخص نے اس کو قتل کر دیا۔ مگر جب اس کی پیشانی پر سجدہ کا گہرا داغ دیکھا تو بہت پچھتایا۔

خوارج کی جماعتیں اسی طرح سلسلے وار نکلنے لگیں۔ یہاں تک کہ عراق پر ان کا خوف چھا گیا۔ امیر معاویہ نے یہ مناسب سمجھا کہ اس صوبے میں کارآزمودہ مدبّروں کو والی مقرر کریں جو حسن سیاست سے ان کا مقابلہ کر سکیں چنانچہ مغیرہ بن شعبہ کو کوفہ اور زیاد کو بصرہ کے لیے نامزد کیا۔

خوارج اور بنی مروان

خوارج کا زور برابر بڑھتا گیا لیکن باہمی اختلاف کی وجہ سے ان کی دو جماعتیں ہو گئیں ایک عراق میں رہی جس کا مرکز بصرہ کے علاقے میں مقام بطائح تھا۔ انھوں نے کرمان سے فارس اور اہواز تک قبضہ کر لیا تھا۔ بصرہ پر بھی ان کا خوف غالب تھا۔ ان کے نامی امرا میں سے نافع بن الازرق اور قطری بن الفجاۃ تھے۔

دوسری جماعت یمامہ سے حضر موت، یمن اور طائف تک مستولی تھی۔ ان کے مشہور سرداروں میں سے ابو طالوت نجدہ بن عامر اور ابو فدیک گزرے ہیں۔

مہلّب بن ابی صفرا

نافع بن ازرق تمام خوارج میں سخت تر تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ لوگ دین کی مدد کے لیے تلوار لے کر کھڑے ہو جائیں صرف وہی مسلمان ہیں اور باقی سب کافر۔ فتنہ سے کنارہ کشی کے بہانے سے الگ بیٹھ جانا اور تیغ بکف ہو کر دین کی خدمت کے لیے نہ نکلنا

کفر ہے۔ اس وجہ سے وہ اور اس کی جماعت جہاد۔ جانفروشی اور شجاعت میں انتہائی حد پر تھے۔ انھوں نے بصرہ کے قریب تک قبضہ کر لیا۔ اہل بصرہ میں سخت پریشانی پھیل گئی۔ وہاں کے اہل الرائے اور رؤسا جمع ہو کر مہلّب بن ابی صفرہ کے پاس گئے جو اموی فوج کا ایک نامور سپہ سالار تھا اور کہا کہ خوارج کی مہم بلا تمہارے سر نہیں ہو سکتی۔ اس نے چند شرطوں کے ساتھ ان کی درخواست قبول کر لی اور خوارج کے مقابلے کے لیے آیا۔ مروانی سلطنت کی پوری طاقت اس کے پس پشت تھی۔ جنگ کا سلسلہ برابر جاری رہا اور کسی فریق کو شکست نہیں ہوئی۔ جب حجاج بن یوسف عراق کا والی ہوا تو اس نے خلیفہ کے حکم سے کوفہ اور بصرہ سے مہلب کے لیے مسلسل کمک بھیجنی شروع کی۔ سال گزر گئے لیکن پھر بھی وہ کچھ نہ کر سکا۔ تنگ آ کر حجاج نے براء بن قبیصہ کو لشکر گراں کے ساتھ مدد کے لیے بھیجا اور مہلب کو لکھا کہ اس مہم کو جلد ختم کرنا چاہیئے۔ مہلّب ساری فوج لے کر خارجیوں کے مقابلے میں صف آرا ہوا۔ اپنے ساتوں بیٹوں کو ایک ایک دستہ کا امیر بنایا۔ خود ایک ٹیلے پر بیٹھ کر احکام دیتا تھا۔ سخت معرکہ آرائی ہوئی، رات کو فوجیں واپس آئیں۔ براء نے کہا کہ تمہارے بیٹوں جیسے بہادر اور تمہارے سواروں جیسے سوار میں نے آج تک نہیں دیکھے اور نہ اس قسم کی سخت لڑائی میری نظر سے گزری لیکن فتح آسمان سے اترتی ہے انسان کی کوشش پر موقوف نہیں ہے۔ اس نے وہاں سے واپس آ کر حجاج کو ساری کیفیت سنائی اور کہا کہ نہ مہلب کا قصور ہے نہ فوج کا بلکہ خوارج کی جماعت نہایت جانباز اور سرفروش ہے۔ ان سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں ہے۔

آخر مہلّب ان کو مغلوب نہیں کر سکا لیکن خود خوارج میں ایک خون کے معاملے میں اختلاف پڑ گیا جس کی وجہ سے ان میں دو جماعتیں ہو گئیں اور آپس میں لڑنے لگیں۔ حجّاج چاہتا تھا کہ اسی حالت میں ان پر حملہ کر دیا جائے لیکن مہلّب خاموش رہا جب دونوں فریق خوب لڑ چکے اور قطری اپنے ساتھیوں کو لے کر طبرستان کی طرف چلا گیا اس وقت مہلّب نے عبد ربّہ کی جماعت کی طرف اپنی فوج بڑھائی اور ان سب کو قتل کر دیا۔

اس فتح کے بعد بصرے میں آیا۔ حجاج نے عظیم الشان دربار کیا۔ اس کو اپنے برابر مسند پر بٹھایا۔ شعراء نے اس کی مدح میں قصیدے پڑھے۔ جن لوگوں نے ان لڑائیوں میں بہادری کے جوہر دکھائے تھے ان کو انعامات دیے گئے اور ان کی تنخواہوں میں اضافہ کیا گیا۔

اب قطری کے پیچھے طبرستان میں فوجیں بھیجی گئیں۔ وہ ایک ٹیلے پر چڑھتے ہوئے گھوڑے سے گر کر ہلاک ہو گیا اور اس کے بھی تمام ساتھی مقتول ہو گئے جس سے خوارج کا یہ فرقہ جو نافع بن ازرق کی پیروی کی وجہ سے ازارقہ کہا جاتا ہے ختم ہو گیا۔ یہ واقعہ ۷۷ھ کا ہے۔

دوسرے فرقہ کے خوارج میں صالح اور شبیب نے ۷۶ھ میں سرزمین موصل میں سر اٹھایا۔ حجاج ان کی سرکوبی کے لیے بھی فوجیں بھیجتا رہا جن کو وہ برابر شکست دیتے رہے۔ یہاں تک کہ شبیب ایک بار جرأت کر کے کوفہ میں گھس آیا کئی دن وہاں رہا اور باشندوں پر سختیاں کیں۔ حجاج نے امراء و رؤسائے قبائل کو جمع کر کے مقابلے کی تیاری کی۔ خوارج باہر نکل گئے ان کی تعداد صرف ایک ہزار تھی مگر پچاس ہزار عراقی فوجوں کو جو اُن کے مقابلے کے لیے بڑھی تھیں شکست دے دی اور پھر کوفہ میں آ گئے۔ یہاں چار ہزار شامی فوج تھی جس نے ان کو نیزوں پر رکھ لیا اور سب کو ختم کر دیا۔

خارجیوں کے نزدیک حکومت الٰہی کے سوا انسانی حکومت کو تسلیم کرنا کفر تھا اس وجہ سے مغلوب ہو جانے کی صورت میں بجز قتل ہو جانے کے ان کے لیے کوئی اور سبیل نہ تھی۔

حضرت عمر بن عبد العزیز کے عہد میں خارجیوں نے ان سے جا کر بحث کی۔ گو ان کو عادل دیکھ کر مقابلے کے لیے نہیں کھڑے ہوئے مگر ان کی جماعت بدستور اطاعت سے خارج رہی۔ بنی امیہ کے آخری خلیفہ مروان ثانی کے زمانے میں عراق میں پھر انھوں

نے سر اُٹھایا، اوران کے سردار ضحاک نے موقع دیکھ کر موصل پر چڑھائی کردی۔ والیان صوبہ اس کے مقابلے سے عاجز رہے خلیفہ کا بیٹا عبداللہ نصیبین کا حاکم تھا ضحاک نے اس کا محاصرہ کرلیا۔ اس کی جماعت میں ایک لاکھ آدمی تھے۔ اس لیے مروان خود اپنی کل فوج لے کر مقابلے کے لیے آیا۔ ضحاک مقتول ہوا۔ خوارج نے سعید بن بہدل کو اپنا امیر بنایا اس نے شامی لشکر پر اس بےجگری سے حملہ کیا کہ قلب کو توڑتا ہوا خود مروان کے خیمے تک پہنچ گیا۔ مگر وہاں مارا گیا۔ مروان اور اس کے امرا اس جماعت کے ساتھ برابر جنگ کرتے رہے یہاں تک کہ ۱۳۰ھ میں ان کا خاتمہ ہوا۔ اسی زمانے میں یمامہ اور حضرموت کے خارجیوں کو بھی اُموی فوجوں نے شکستیں دیں۔

خوارج اور بنی عباس

بنی امیہ اور خاص کر مہلب اور مروان نے خارجیوں کی طاقت اگرچہ توڑدی تھی لیکن پھر بھی انھوں نے عباسیوں کے مقابلے میں وہی جوش وخروش دکھایا۔ ۱۳۴ھ میں عمان میں جلندی ایک جماعت لے کر اٹھا۔ سفّاح نے بحری فوج خازم بن خزیمہ کی ماتحتی میں بھیجی۔ جس نے متعدد لڑائیوں کے بعد اس کو شکست دی۔ دس ہزار خارجی مقتول ہوئے۔ منصور کے عہد میں الجزیرہ میں شیبانی مقابلے کے لیے کھڑا ہوا۔ خلافت کی طرف سے فوج پر فوج بھیجی جاتی تھی اور وہ سب کو شکست دے دیتا تھا۔ آخر منصور نے بھی خازم ہی کو ان کے مقابلے کے لیے بھیجا۔ وہ مرورود کے علاقہ کے آٹھ لاکھ آدمی لے کر آیا اور ۱۳۸ھ میں ان کو فنا کیا۔

افریقہ تونس میں خوارج کی صفریہ اور اباضیہ جماعت نے بغاوت برپا کر رکھی تھی۔ جن کے ساتھ کثیر تعداد میں بربر بھی شامل ہو گئے تھے اور قیروان پر قبضہ کر لیا تھا۔ منصور نے یزید بن حاتم کو اس مہم کے لیے منتخب کیا کہ وہ اپنے چچا مہلب کی طرح ان کو فنا کرے یزید ان کے ساتھ پورے پندرہ سال تک لڑتا رہا جن میں ۳۷۵ معرکے ہوئے۔ آخر

میں ان کو مٹا کر چھوڑا۔

مہدی کے زمانے میں بھی یہ جماعت لڑتی رہی۔ آخری کوشش ہارون کے زمانہ میں ولید بن طریف شیبانی کی تھی جو نامور شجاع تھا۔ ہارون نے اس کے مقابلے کے لیے بار بار فوجیں بھیجیں وہ سب کو شکست دیتا رہا جن کے باعث جزیرہ سے لے کر آرمینیہ تک اس کا اقتدار بڑھ گیا۔ اس لیے ہارون نے ایک کارآزمودہ سپہدار یزید شیبانی کو اس مہم پر بھیجا۔ اس کو بھی کئی مہینے لگ گئے برامکہ نے جو اس سے رنجش رکھتے تھے خلیفہ کے کان بھرنے شروع کیے کہ یہ بھی شیبانی وہ بھی شیبانی دونوں باہم ساز باز نہ کرلیں۔ ہارون نے تہدید آمیز حکم بھیجا۔ یزید نے پوری طاقت سے حملہ کیا۔ ولید مارا گیا اور اس کی جماعت مقتول ہوئی۔ اس کے بعد خوارج پھر اُٹھنے کے قابل نہ رہے اور ان کی اجتماعی قوت ختم ہوگئی۔ اب جبکہ امّت میں کوئی جماعت "لاحکم الااللہ" کہنے والی باقی نہیں رہ گئی۔ استبداد نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن نتائج دور رس تھے۔

خارجی مذہب

اس جماعت کی پیدائش کا بنیادی نقطہ "لاحکم الااللہ" ہے۔ یعنی کسی کی حکومت نہیں سوائے اللہ کے۔ صفین کے میدان میں جب ثالثی نامے کی مخالفت ہونے لگی۔ اس وقت کسی نے یہی نعرہ لگادیا جو بجلی کی سرعت کے ساتھ پھیل گیا۔ کیونکہ اس میں ان کے مافی الضمیر کی پوری ترجمانی تھی چنانچہ یہی کلمہ ان کا شعار ہوگیا۔ وہ جب کوئی مجمع کرتے یا ان کے جلسوں میں کوئی تقریر ہوتی تو آخر میں یہی نعرہ لگاتے اس لیے یہ فرقہ خالص سیاسی ہے۔ عام مسلمانوں سے اس کا اختلاف صرف خلافت کے چند مسائل میں ہے۔

ان کے نزدیک صحت خلافت کی شرط جمہور مسلمانوں کا آزاد انتخاب ہے۔ قرشیت کی کوئی قید نہیں حبشی غلام بھی اگر منتخب ہو جائے تو اس کی اطاعت واجب ہے۔ حضرت ابوبکر و عمر کے انتخاب کو جمہوری اور ان کی خلافتوں کو صحیح سمجھتے تھے۔ نیز حضرت عثمان

کی خلافت کو بھی ابتدائی چھ سال تک۔ مگر جب سے وہ بنی امیہ کی رائے میں آگئے اور شیخین کے طریقے پر نہیں رہے ان کا عزل واجب تھا۔ حضرت علی کی خلافت کو بھی صحیح مانتے تھے، مگر جب سے ثالثی نامہ لکھا اس وقت سے ان کی رائے میں کافر ہو گئے۔ اصحاب جمل حضرت طلحہ و زبیر وغیرہ کو اس بنا پر کہ خلیفۂ برحق حضرت علی سے لڑے نیز ابوموسیٰ اشعری اور عمرو بن العاص کو بھی کافر قرار دیتے تھے۔ غرض ان کا سارا اختلاف "حکومت الٰہی" کے محور پر گھومتا تھا۔ اور اسی نقطہ پر وہ تمام امّت سے الگ ہو گئے تھے۔

کلمۂ حق

مورخوں کا بیان ہے کہ حضرت علی نے جب ان کے نعرہ "لاحکم الا اللہ" کو سنا تو فرمایا کہ "کلمۃ حق ارید بہا الباطل" یعنی بات تو سچی ہے لیکن اس کا جو مطلب لیا گیا ہے وہ باطل ہے یہ سمجھتے ہیں کہ سوائے اللہ کے کوئی امیر نہیں حالانکہ انسانوں پر کسی انسان کا امیر ہونا لازمی ہے جو نظام کو قائم رکھے۔

میرے نزدیک اس قول کی نسبت حضرت علی کی طرف صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ خوارج خود ان کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے اس لیے وہ جانتے تھے کہ یہ انسان کی امارت کے منکر نہیں ہیں بشرطیکہ اس کی امارت قرآن کے مطابق ہو۔ لہٰذا ان کے کلمہ کی یہ تاویل جو بداہتاً غلط تھی حضرت علی کر ہی نہیں سکتے تھے۔

اصلیت یہ ہے کہ خوارج کی جماعت کل اُمّت کے خلاف تھی۔ اس لیے مخالف فرقوں نے ان کو بدنام کرنے کے لیے جہاں جہاں موقع پایا جھوٹی روایتیں گھڑ یں۔ ان کا سب سے بڑا حریف مہلّب بن ابی صفرہ تھا۔ وہ تلوار سے بھی لڑتا تھا اور ان کی مذمت میں جھوٹی حدیثیں بھی گھڑتا تھا۔ اس کے کذب کی اس قدر شہرت تھی کہ بنی ازد کے لوگ جب اس کو دیکھتے تو کہتے۔

انت الفتیٰ کل الفتیٰ   لوکنت تصدق ماتقول

تو بہادر بڑا بہادر   جو تیری باتیں بھی سچی ہوتیں

علاوہ بریں خود حضرت علی نے اپنے آخری ایام میں وصیت فرمائی۔

لاتقاتلوا الخوارج بعدی فلیس من طلب الحق فاخطاہ کمن طلب الباطل فادرکہ	یعنی میرے بعد خوارج سے جنگ نہ کرنا۔ جو حق کا طالب ہو گو اس کو حاصل نہ کر سکے اس سے بہتر ہے جو باطل کا طلبگار ہو اور اس کو حاصل کر لے۔

اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ حضرت علی خوارج کو حق کا طالب سمجھتے تھے اور شامیوں کو باطل پرست۔

خوارج کے فرقے

اس جماعت کی ابتدائی مخالفت مسئلہ خلافت ہی تک محدود تھی مگر بعد میں بعض دیگر مسائل کا اضافہ ہوا جن میں جزوی اختلافات کے باعث اس کے بیس فرقے ہو گئے۔ سب سے بڑا فرقہ نافع بن ازرق کا تھا جو اس کے نام کی نسبت ازارقہ مشہور ہوا۔ یہ لوگ شرعی اعمال نماز۔ روزہ۔ صدق اور عدل وغیرہ کو بھی ایمان کا جزو قرار دیتے تھے۔ ان کے نزدیک کوئی شخص اللہ و رسول کو دل سے مان کر اور زبان سے اقرار کر لینے پر بھی کافر ہے اگر ان کے احکام پر عمل نہ کرے۔ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر مطلق سمجھتے تھے۔ نیز اپنے سوا تمام مسلمانوں کو جو انسانی حکومت پر راضی ہو گئے تھے کافر قرار دیتے تھے جن کے ساتھ نہ مناکحت جائز تھی نہ ان کے ہاتھ کا ذبیحہ حلال۔ ظالم سلاطین کے مقابلے کے لیے قوت کا اندازہ کیے بغیر تلوار لے کر اٹھ جانا فرض سمجھتے تھے۔ جو کوئی باوجود قدرت کے ایسا نہ کرے خواہ انھیں کی جماعت کا کیوں نہ ہو کافر ہے۔

دوسرا گروہ نجدہ بن عامر کا تھا۔ یہ جہالت کو عذر قرار دیتا تھا اور اجتہاد میں کسی سے غلطی ہو جائے تو اس کو معذور سمجھتا تھا۔ ان امور میں نافع کے ساتھ اس کے مناظرے بھی ہوئے۔

تیسری جماعت اباضیہ تھی جو عبداللہ بن اباض تمیمی کی پیرو تھی۔ یہ لوگ ازارقہ

کے مقابلے میں بہت نرم تھے۔ دعوت و اتمام حجت کے بغیر مخالفوں پر اچانک حملہ جائز نہیں سمجھتے تھے نہ دیگر مسلمانوں کو عرب جاہلیت کے بت پرستوں کی طرح قرار دیتے تھے۔ غالباً اسی صلح پسندی کی وجہ سے ان کے نام لیوا آج بھی شمالی افریقہ، سواحل عمان، حضرموت اور زنجبار میں پائے جاتے ہیں۔ اس نرمی کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ابن اباض عہدِ عباسی میں پیدا ہوا تھا جب کہ خوارج کی قوت ٹوٹ چکی تھی اور صرف مذہبی حرکت باقی رہ گئی تھی۔

عبداللہ بن صفّار رئیس خوارج کے پیرو جو صفریہ کہے جاتے تھے ان لوگوں کو بھی برا نہیں سمجھتے تھے جو فتنہ سے الگ ہو کر بیٹھ جائیں۔ چنانچہ یہ ساری جماعت خانہ نشین ہو کر اُمّت میں جذب ہو گئی۔

خوارج کے صفات

خوارج عقائد اور فرائض دونوں میں متشدد تھے اور عبادت میں سخت انہماک رکھتے تھے۔ شہرستانی نے ان کی جماعت کے متعلق لکھا ہے کہ اہل صوم و صلوٰۃ ہیں۔ شب بیداری ان میں عام تھی، زیاد نے ایک خارجی کو قتل کیا پھر اس کے غلام سے اس کی کیفیت پوچھی۔ اس نے کہا کہ میں نے اس کے لیے نہ کبھی رات میں بستر بچھایا نہ دن میں کھانا۔ یعنی وہ قائم اللیل اور صائم النہار تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباس کو جب حضرت علی نے خوارج کے ساتھ مناظرے کے لیے بھیجا تو وہ ان کی پیشانیوں پر سجدوں کے داغ اور ان کے چہروں پر عبادت کا نور دیکھ کر بہت متاثر ہو گئے۔

جھوٹ کو ان کا ہر فرقہ زنا و شراب سے بھی بدتر جانتا تھا۔ اور تقیہ کو بجز اس خاص صورت کے جس میں قرآن نے اس کو مباح کیا ہے حرام سمجھتا تھا۔ بغدادی نے اپنی کتاب "اصول الدین" میں لکھا ہے "خوارج کے ایمان و عمل کی بنیاد خالص قرآن پر تھی۔ روایات کو دین نہیں مانتے تھے۔"

ان کے نزدیک مخالفوں سے جہاد کرنا نجات کا بہترین ذریعہ اور دین کا اہم ترین فریضہ تھا جس میں ان کی عورتیں بھی شامل ہوتی تھیں۔ وہ غیر قرآنی حکومت کو مٹانا لازمی سمجھتے تھے اور اس میں جانی و مالی کسی قربانی سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ دشمن کے مقابلے سے روگردانی ان کے نزدیک کفر تھی۔

لہو و لعب کو کسی حالت میں جائز نہیں رکھتے تھے اور نہ تمسخر و مذاق کو۔ یہاں تک کہ ان کے اشعار بلکہ غزلوں میں بھی وہی دینی حمیت اور جہاد کے حماسی جذبات ہیں جن میں وہ پرورش پاتے تھے۔ نگاہوں میں صرف تقویٰ تھا اور دین۔ اور انھیں کی مرافقت میں سرکیف رہتے تھے۔

اُن لوگوں کو انسانیت سے گرا ہوا سمجھتے تھے جنھوں نے دنیاوی مال و جاہ کے لیے اپنی حریتِ ضمیر کو نام نہاد خلفاء کے ہاتھ فروخت کر رکھا تھا۔ اور انسانی حکومت پر راضی ہو گئے تھے۔

خلفاء اور امراء کے درباروں میں بھی دعوت و تبلیغ کے لیے برابر اپنے وفود بھیجتے تھے اور ان کی دولت و حشمت سے ذرا بھی متاثر نہ تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ان کی گفتگو سُن کر فرمایا۔

"میں جانتا ہوں کہ تم دنیا یا دولت کی طلب کے لیے نہیں نکلے ہو۔ تمھارا مقصود آخرت ہے۔ مگر تم نے راستہ غلط اختیار کیا۔"

ان کی ساری تاریخ شجاعت سے مزین ہے اور ان کے جنگی کارنامے بےنظیر ہیں۔ شبیب خارجی ایک ہزار آدمیوں سے کوفہ کی پچاس ہزار فوج کو شکست دے کر شہر میں داخل ہو گیا تھا۔ ابن زیاد نے ابوبلال خارجی کے مقابلے کے لیے ابن زرعہ کو دو ہزار سپاہیوں کے ساتھ بھیجا تھا۔ مقام آسک میں جنگ ہوئی جس میں صرف چالیس خارجیوں نے ان دو ہزار کو مار بھگایا۔ اس پر ایک خارجی شاعر نے کہا۔

ا اَلفا مومن فی ما زعمتم — ویہزمہم بآسک اربعونا
کذبتم لیس ذاک کما زعمتم — ولکن الخوارج مومنونا

یعنی "تمہارے گمان کے مطابق وہ دو ہزار مومن تھے جن کو آسک میں چالیس آدمیوں نے شکست دے دی۔ دراصل تمہارا گمان ہی غلط ہے خوارج ہی مومن ہیں۔" اس واقعہ کے بعد ابن زرعہ جب کوفہ کے بازاروں میں یا سڑکوں پر نکلتا تو بچے اس کا مذاق اڑانے کے لیے آوازے کستے کہ وہ تمہارے پیچھے ابو بلال آرہا ہے۔"

خوارج کے دلوں میں خلوص تھا اور زبانوں میں صداقت، اسی وجہ سے ان کی باتیں صاف، بے لاگ اور پر اثر ہوتی تھیں اور ان کے فقرے دلوں تک نفوذ کرتے تھے ابن زیاد نے ان سے قید خانے بھر رکھے تھے اور کسی کو چھوڑتا نہ تھا۔ کہتا تھا کہ ان کے خطبے ان آتشیں شعلوں کے مانند ہیں جو نیستان میں آگ لگا دیتے ہیں۔

عبدالملک بن مروان کے سامنے ایک خارجی لایا گیا۔ گفتگو سے معلوم ہوا کہ اس میں عقل و فہم ہے۔ سمجھانے لگا کہ خروج سے باز آجاؤ۔ خارجی نے اپنے عقائد و خیالات اس فصاحت اور خوبی سے بیان کیے کہ عبدالملک نے کہا کہ میں خیال کرنے لگا کہ جنت انھیں لوگوں کے لیے بنائی گئی ہے اور جو جہاد یہ کرتے ہیں وہ خود ہمارا فریضہ ہے۔

ابو حمزہ خارجی نے اپنی جماعت کے وصف میں لکھا ہے۔

"وہ جوانی میں بزرگانہ صفات رکھتے ہیں۔ برائی کی طرف سے ان کی آنکھیں بند ہیں۔ باطل کی سمت قدم نہیں اٹھاتے۔ عبادت گزار اور شب زندہ دار راتوں کی تاریکی میں اللہ ان کو دیکھتا ہے کہ سر نیچا کیے ہوئے اس کے کلام کی تلاوت کر رہے ہیں۔ جنت کا بیان آتا ہے تو شوق میں رو پڑتے ہیں اور جہنم کے ذکر پر خوف سے کانپنے لگتے ہیں گویا کہ اس کو دیکھ رہے ہیں۔ سجدوں کی کثرت سے ان کے گھٹنوں، ہتھیلیوں، ناکوں اور

پیشانیوں پر گھٹے پڑ گئے ہیں، پھر جب کمانیں کھنچتی ہیں۔ تیرے نکلتے ہیں۔ تلواریں چمکتی ہیں اور میدان جنگ میں سپاہیوں کے نعروں سے موت کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ اس وقت بلا خطر آگے بڑھتے ہیں، مارتے ہیں اور مرتے ہیں۔ گھوڑوں سے گرتے ہیں خون میں لتھڑے ہوئے۔ درندے ان کی وہ کلائیاں چباتے ہیں جن پر ٹیکے لگا کر مدتوں وہ اپنے رب کو سجدے کرتے رہے اور پرندے ان کی وہ آنکھیں نکالتے ہیں جو شب ہائے دراز کی تاریکیوں میں اللہ کے خوف سے آنسو بہایا کرتی تھیں۔"

جماعت خوارج

خوارج جو دعوے لے کر کھڑے ہوئے تھے یعنی "لاحکم الا للہ" وہ قرآن کی کھلی ہوئی تعلیم ہے اور جس زمانے میں ان کا ظہور ہوا اس زمانے میں صحابہ اچھی تعداد میں موجود تھے۔ مگر بجز حضرت انس بن مالک کے جو مدینے میں رسول اللہ کے خادم تھے اور بصرہ آباد ہونے کے بعد اس میں آکر سکونت اختیار کر لی تھی اور کسی صحابی کا نام ان کی جماعت میں نہیں ملتا۔ میرے خیال میں اس کے حسب ذیل وجوہ ہو سکتے ہیں۔

(۱) ان کا خروج سب سے پہلے حضرت علی کے مقابلہ میں ہوا جن کے عالیشان رتبے سے سب واقف تھے۔ ان کو چھوڑ کر خارجیوں کا ساتھ کیسے دیتے۔

(۲) صحابہ جماعت کا ساتھ چھوڑنا جائز بھی نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب یزید کی بیعت ہوئی اس وقت حضرت عبداللہ بن عمر اور عبداللہ ابن عباس نے جو باوجود اس کے کہ پہلے سے اس کے خلاف تھے بیعت کر لی اور جماعت سے الگ ہونا گوارا نہ کیا۔

(۳) خوارج میں انھوں نے بدویت، قساوت اور کوتاہ نظری دیکھی۔ اس لیے ان کے ساتھ شامل ہونا پسند نہ کیا۔

(۴) خوارج فنا ہو گئے اور ان کی تاریخ مرتب نہ ہو سکی۔ ادبار میں سے مبرد نے الکامل

ہیں اور ابن ابی الحدید شیعی نے شرح نہج البلاغہ میں اگر ان کے کچھ حالات نہ لکھائے ہوتے تو ہم تک صرف ان کا نام ہی نام پہنچتا۔ اس لیے خوارج کی جماعت کے متعلق ہمارا علم بھی محدود ہے۔ شروع میں اس جماعت میں زیادہ تر وہ عرب شریک ہوئے جو بصرہ اور کوفہ کی چھاؤنیوں میں تھے۔ ان میں بھی بنی تمیم کی تعداد زیادہ تھی جو سخت جنگجو تھے اور جن پر سادگی اور بدویت غالب تھی۔ بعد میں اور لوگ بھی شامل ہوتے گئے۔ خاص کر موالی (عجمی نومسلم) جو بنی امیہ کے مظالم سے تنگ تھے۔ انھوں نے خوارج میں آغاز اسلام کی سادگی، اخوت، مساوات اور جمہوریت دیکھی اس وجہ سے ساتھ دیا۔

تابعین میں سے عکرمہ مولائے ابن عباس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ خوارج کے ہم خیال تھے۔ امام حسن بصری بھی تحکیم کے معاملے میں خوارج کی رائے کو صحیح سمجھتے تھے۔ وہ جب اپنی مجلس میں بیٹھتے اور حضرت علی کا ذکر کرتے تو افسوس کے ساتھ کہتے۔

"فتح وظفر برابر امیر المومنین کا ساتھ دے رہی تھی یہاں تک کہ انھوں نے ثالث مان لیا۔ ثالث کیوں مانا تم تو حق پر تھے۔ آگے کیوں نہ بڑھے حق تو تمھارے ساتھ تھا۔"

عہد عباسی میں بعض نامور علماء بھی ان کے ہم خیال ملتے ہیں۔ ابن خلکان نے ابو عبیدہ معمر بن مثنیٰ کے متعلق لکھا ہے کہ خارجیوں کے موافق تھے۔ ایسی ہی روایتیں ابو حاتم سجستانی اور ہیثم بن عدی کے بارے میں ہیں۔ لیکن یہ لوگ صرف نظری حیثیت سے ان کی بعض باتوں کو صحیح سمجھتے تھے عملی طور پر کبھی ان میں شریک نہیں ہوئے بلکہ خلفاء و امراء کی تابعداری کرتے رہے۔ عقائد نگاروں نے بیشتر انھیں لوگوں کے خیالات کو خارجیوں کی طرف منسوب کیا ہے۔ محض اس وجہ سے کہ وہ اس نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ حالانکہ خارجیوں کی نظر میں یہ سب کافر ہی تھے۔

تباہی کے اسباب خوارج کی تاریخ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں نہیں

لکھی گئی۔ جو کچھ ان کے بارے میں ملتا ہے علاوہ اس کے کہ بہت تھوڑا ہے غیروں کی زبان سے ہے اور ایک طرفہ ہے۔ اس لیے ان کی تباہی کے صحیح اسباب کا پتہ لگانا مشکل ہے۔ میرے قیاس کے مطابق حسب ذیل وجوہ ہیں۔

(۱) خوارج اپنے عقیدے اور عمل میں نہایت متشدد تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر ان میں مخالفت ہو جاتی اور الگ الگ جھنڈے کھڑے کر کے آپس ہی میں لڑنے لگتے تھے۔ ۷۷ھ میں جبکہ ازارقہ کے مقابلے میں مہلّب پوری طاقت سے سابور میں جما ہوا تھا۔ خارجیوں میں سے ایک نامی شہسوار مقعطر نے کسی جھگڑے کی بنیاد پر اپنی ہی جماعت کے ایک آدمی کو مار ڈالا۔ مقتول کے ورثہ اپنے امیر قطری کے پاس گئے اور کہا کہ قاتل کو قصاص کے لیے ہمارے حوالے کر دو۔ اس نے انکار کیا اور کہا کہ مقعطر فاضل اور دین دار شخص ہے اس نے شرعی تاویل کی بنا پر قتل کیا ہے اگر اس کا جرم ثابت ہو سکتا ہے تو زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس نے تاویل میں غلطی کی ہو ایسی حالت میں میں قصاص کو لازم نہیں سمجھتا۔

اس فیصلے کو مدعیوں نے نہیں مانا اور قطری کی بیعت کو فسخ کر کے عبد ربہ الکبیر کو اپنا امیر بنا لیا۔ بہت سے لوگ ان کے ساتھ ہو گئے۔ دونوں جماعتوں میں لڑائی ہونے لگی جو تقریباً ایک مہینے تک جاری رہی۔ آخر میں قطری شکست کھا کر اپنے ساتھیوں کو لیے ہوئے طبرستان کی طرف چلا گیا۔ مہلب نے جو سالہا سال کی کوشش کے باوجود ان کو شکست دینے سے عاجز رہا تھا اب موقع پا کر پہلے عبد ربہ کی جماعت کو قتل کر دیا۔ پھر قطری کے پیچھے فوجیں بھیجیں جنھوں نے اس کا اور اس کے ساتھیوں کا خاتمہ کر ڈالا۔ ایک آدمی کے خون کے جھگڑے میں یہ پوری جماعت جو عظیم الشان طاقت تھی بالکل تباہ ہو گئی۔ اس سے پہلے نجدہ بن عامر کی جماعت بعض معمولی اختلافات پر ان سے الگ ہو کر یمامہ اور حضر موت کی طرف چلی گئی تھی۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے

کہ ان کو قیادت اچھی نہیں ملی یا یہ کہ غیر معمولی دینی حمیت اور جوش تہوّر کے باعث افراد میں اطاعت کامل نہ تھی ورنہ اگر اس ساری جماعت نے مل کر ہم آہنگی سے کام کیا ہوتا تو بنی امیّہ کی خلافت کا قائم رہنا مشکل تھا۔

(۲) ان کی طبیعتوں میں بدویت اور قساوت اس قدر تھی کہ مخالفوں کے بوڑھوں بچوں اور عورتوں کے قتل کو بھی جائز رکھتے تھے اور ان کو عرب جاہلیت کے بت پرستوں کے برابر قرار دیتے تھے جن کے ساتھ کسی قسم کا تعلق حرام تھا جب تک اسلام نہ لائیں جو غیر خارجی ان کو مل جاتا اس کو جان سے مار دیتے۔ ایک بار واصل بن عطا معتزلہ کا مشہور امام معہ اپنے چند ساتھیوں کے ان کے ہاتھ میں پڑ گیا۔ جان بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ ان کا عمل ظاہر نصوص پر ہے جس سے بال برابر بھی ہٹنا کفر سمجھتے ہیں اس وجہ سے اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ تم میں سے کوئی ایک حرف نہ بولے جو کچھ وہ سوالات کریں گے ان کے جوابات میں ہی دوں گا۔ جب خارجیوں نے پوچھا کہ تم لوگ کون ہو۔ اس نے کہا کہ ہم مشرک ہیں آپ کے پاس پناہ لینے آئے ہیں کہ قرآن سنیں۔ انھوں نے قرآنی آیات سنائیں۔ اس نے کہا کہ اب ہم کو ہمارے گھر بھی پہنچا دیجیے کیوں کہ قرآن میں ہے :۔

اگر کوئی مشرک تیرے پاس پناہ لینے آئے تو اسے پناہ دے تاکہ وہ اللہ کا کلام سنے پھر اس کو اس کے ٹھکانے پر پہنچا دے ۔	وان احد من المشرکین استجارک فاجرہ حتی یسمع کلام اللہ ثم ابلغہ مامنہ

انھوں نے آدمی ساتھ کر دیئے جنھوں نے آبادی تک پہنچا دیا۔

ان کے عدم تفقہ کی بابت مورخین لکھتے ہیں کہ ان کے نزدیک کسی یتیم کا ایک پیسہ بھی ناجائز طریقے سے کوئی کھائے تو جہنمی ہے کیونکہ یہ قرآن میں ہے لیکن اگر اس کو مار ڈالے یا اس کا پیٹ چاک کر دے تو جہنمی نہیں ہے اس لیے کہ کوئی آیت اس کی تصریح نہیں کرتی

اسی طرح کسی مشرک کے درخت کا ایک پھل بھی بلا قیمت کھانا حرام تھا مگر اس کو قتل کر دینا حلال۔

(۳) اُنھوں نے اپنے سوا تمام اُمّت کو کافر اور مشرک اور سارے اسلامی خطّوں کو دار الحرب قرار دیا اور سب کے مقابلے میں جنگ کے لیے کھڑے ہو گئے۔ دین و دنیا کی اصلاح کا مدار صرف تلوار پر رکھا اور اسی سے سارے مسائل سلجھانے کی کوشش کی۔ اس لیے ان کی تحریک تعمیری سے زیادہ تخریبی تھی جو کم تر کامیاب ہوا کرتی ہے۔ امّت پوری قوت سے ان کو مٹانے کے لیے آمادہ ہو گئی اور بالآخر کم و بیش ڈیڑھ سو سال تک لڑتے بھڑتے اور اسلام کی قوت کو کمزور کرتے ہوئے فنا ہو گئے اور افسوس یہ ہے کہ ان تمام خونریزیوں سے حکومت الٰہی کا عنوان جس کے لیے وہ اٹھے تھے ذرا بھی رنگین نہ ہو سکا بلکہ نگاہوں سے اور بھی اوجھل ہو گیا۔ یہاں تک کہ ساری اُمّت کے دل و دماغ پر استبداد ایک حقیقت مسلمہ بن کر چھا گیا۔

شیعہ کا اختلاف بھی جمہور امت سے خلافت ہی کے مسئلہ میں ہے۔ اور یہ فرقہ بھی خوارج کی طرح خالص سیاسی ہے جس پر بعد میں دینی رنگ چڑھا دیا گیا۔

شیعیت کا پہلا تخم صحابہ میں سے وہ جماعت تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علی کو خلافت کا زیادہ حقدار سمجھتی تھی مثلاً حضرت عباس۔ ابوذر غفاری مقداد بن اسود۔ عمار بن یاسر اور سلمان فارسی وغیرہ لیکن یہ خیال سادہ تھا جس میں نہ نبی کی طرح امام کی تقدیس شامل تھی نہ اس کے منصوص ہونے کا عقیدہ تھا۔ بلکہ صرف حضرت علی کی محبت۔ عظمت اور قرابت رسول ؑ کی خصوصیت کی وجہ سے ان کو خلیفہ دیکھنا زیادہ پسند کرتے تھے۔

لیکن انتخاب حضرت ابوبکر کا ہو گیا اور تاریخ شاہد ہے کہ حضرت علی نے ان کی بیعت کر لی اور اپنی خلافت کا نہ دعویٰ کیا نہ اپنے حق کی کوئی نص پیش کی۔ اس کے بعد حضرت عمر جب خلیفہ ہوئے تو ان کے ہاتھ پر بھی بیعت کی اور ان کی زندگی بھر ان کے حامی اور مطیع رہے۔ پھر حضرت عثمان کی خلافت کو بھی تسلیم کیا۔

حضرت عثمان خلیفہ ہو جانے کے چند سال بعد اپنے خاندان بنی امیہ کے اثر میں آ گئے۔ اور بڑی بڑی ولایات کی حکومتیں ان کو دے دیں۔ جس سے حریفوں کی نگاہوں میں ان کی خلافت کا انداز اموی حکومت کا معلوم ہوا۔ اس وقت مخفی جمعیتیں قائم کی گئیں اور عبداللہ بن سبا کی سازش سے جو صنعا کا یہودی تھا عراق سے لے کر مصر تک ان کے خلاف بغاوت پھیلائی گئی۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ ان مقامات کے لوگوں نے مدینہ میں آ کر حضرت عثمان کو قتل کر ڈالا اور حضرت علی کے ہاتھ پر بیعت کی۔

اس سبائی تحریک میں شیعیت میں وصی کا عقیدہ داخل کیا گیا یعنی مشہور کیا گیا کہ رسول اللہ صلعم نے اپنے بعد حضرت علی کی خلافت کی وصیت کی ہے۔ اور وہ ان کے وصی ہیں۔

بعد میں اس کی تشریح یہ کی گئی کہ امام جمہور کے انتخاب سے نہیں ہوتا۔ کیوں کہ امامت دین کا رکن ہے اور ان عام مصالح میں سے نہیں ہے جو امت سے تعلق رکھتی ہیں اس لیے خود نبی کا فریضہ ہوتا ہے کہ اپنے بعد امام کو متعین کر جائے۔ پھر ہر امام دوسرے امام کی تعیین کرتا ہے۔

اماموں کا انتخاب اللہ کے ہاتھ میں رکھ دینے کی وجہ سے ان کی عظمت کا بھی دعویٰ کیا گیا کہ وہ ہر قسم کے گناہ بلکہ غلطی و خطاء سے بھی معصوم ہیں۔ پھر اس سے آگے بڑھ کر امام منصوص کی معرفت اصول ایمان میں سے قرار دی گئی اور یہی نقطہ مومن اور کافر کے درمیان حد فاصل رکھا گیا۔ پھر یہ تلقین کی گئی کہ یہ امامت صرف حضرت علی اور ان کی اولاد کا حق ہے۔ اس طرح بتدریج خاندانی حکومت کا سیاسی دعویٰ مذہب بنا لیا گیا۔

اس جماعت میں خوارج سے بھی زیادہ فرقے ہوئے۔ کچھ تو دینی مبادی میں اختلافات کی وجہ سے اور کچھ ائمہ کی تعیین میں۔ لیکن اکثر منقرض ہو گئے۔ اب ان کے بڑے فرقے دو باقی رہ گئے ہیں۔ زیدیہ و امامیہ۔

زیدیہ

یہ جماعت امام زید بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب کی پیرو ہے۔ اور شیعہ میں سب سے زیادہ معتدل اور اہل سنت سے قریب تر ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ امام زید رئیس معتزلہ واصل بن عطا کے شاگرد تھے۔ اور اس کی تعلیم کا اثر ان کے اوپر پڑا تھا۔ وہ فاضل کے ہوتے مفضول کی خلافت کو جائز سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے حضرت علی کو جملہ صحابہ میں افضل مان کر بھی شیخین کی خلافت کو صحیح سمجھتے تھے۔ امام کی تعیین کے لیے

وحی الٰہی یا نص کے قائل نہ تھے۔ بلکہ بنی فاطمہ میں سے جو بھی عالم، زاہد، سخی، شجاع ہو اور اہلیت رکھتا ہو اور امامت کا دعویٰ لے کر کھڑا ہو جائے وہ امام ہے۔

ان کے نزدیک امامت محض نظری شے نہیں تھی بلکہ عملی تھی جس کے لیے خروج لازمی تھا۔ ۱۲۲ھ میں انھوں نے جب ہشام بن عبدالملک کے مقابلے میں خروج کیا تو شیخین کی خلافت کے قائل ہونے کی وجہ سے شیعہ امامیہ نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور الگ ہو گئے۔ اور اُسی دن سے رافضی کہے جانے لگے۔ آخر وہ مقتول و مصلوب ہوئے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے یحییٰ اپنی امامت کا دعویٰ لے کر اُٹھے۔ وہ بھی ۱۲۵ھ میں مارے گئے۔

آج یمن کے مسلمانوں میں بڑی تعداد اس فرقہ کی ہے۔ اہل سنت سے ان کے اختلافات اصول و فروع میں بہت تھوڑے ہیں۔

امامیہ

ان کا نام امامیہ اس لیے رکھا گیا کہ ان کی تمام مذہبی تعلیمات کا مرکزی نقطہ امام ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت حضرت علیؓ کا حق ہے۔ یہ صرف اہلیت و صلاحیت کے باعث بلکہ بطریق النص پھر ان کے بعد امامت انھیں کی فاطمی اولاد میں محصور ہے۔ جو یکے بعد دیگرے متعین ہیں۔ اور ان کی معرفت اصول ایمان میں سے ہے۔

ان کے دو فرقے ہیں۔ اسماعیلیہ اور اثنا عشریہ۔ اسماعیلیہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ امام سادس جعفر صادق کے بیٹوں میں سے امامت موسیٰ کاظم کی طرف نہیں منتقل ہوئی جیسا کہ اثنا عشریہ کا خیال ہے بلکہ اسماعیل امام ہوئے۔ اسی نسبت سے اس جماعت کا نام اسماعیلی رکھا گیا۔ یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ امام کے پاس جب قوت نہ ہو تو وہ مستور رہے اور صرف اس کے دعاۃ تبلیغ کریں۔ چنانچہ ان کے ائمہ برابر مخفی رہے یہاں تک کہ عبیداللہ المہدی قوت حاصل کرنے کے بعد ظاہر ہوا۔ اور ۲۹۵ھ میں اس نے افریقہ میں فاطمی خلافت قائم کی۔ غالباً اسی وجہ سے یہ جماعت باطنی کہی جاتی ہے۔

اثنا عشری بارہ امام کے قائل ہیں جو سلسلہ بہ سلسلہ حضرت علی سے امام غائب تک ہیں۔ توضیح کے لیے ان کا مختصر شجرہ لکھ دیتا ہوں۔

۱۔ حضرت علی ابن ابی طالب

۲۔ امام حسن متوفی سنہ ۵۰ھ
حسن
عبداللہ المحض
محمد (نفس زکیہ) ابراہیم
یہ دونوں بھائی خلیفہ منصور پر خروج کر کے مقتول ہوئے۔

۳۔ امام حسین مقتول سنہ ۶۱ھ
۴۔ علی (زین العابدین) متوفی سنہ ۹۴ھ
۵۔ ابوجعفر محمد باقر متوفی سنہ ۱۱۳ھ
۶۔ ابوعبداللہ جعفر صادق متوفی سنہ ۱۴۸ھ
۷۔ موسیٰ کاظم متوفی سنہ ۱۸۳ھ
۸۔ ابوالحسن علی رضا متوفی سنہ ۲۰۲ھ
۹۔ ابوجعفر محمد جواد متوفی سنہ ۲۲۰ھ
۱۰۔ علی ہادی متوفی سنہ ۲۵۴ھ
۱۱۔ ابومحمد حسن عسکری متوفی سنہ ۲۶۰ھ
۱۲۔ محمد (مہدی منتظر) سنہ ۲۶۰ھ میں غائب ہوئے

اسماعیل
محمد
اسماعیل
محمد
احمد
عبداللہ
احمد
حسین
عبداللہ المہدی بانیٔ دولت فاطمیہ متوفی سنہ ۳۲۲ھ

محمد بن الحنفیہ
ابو ہاشم
بنی عباس نے انھیں کے وصی ہونے کا دعویٰ کر کے خلافت حاصل کی

منصب امامت

شیعہ کے مخصوص عقائد کا مرکزی نقطہ امام ہے اس لیے یہاں امام کے متعلق اس جماعت کے عقائد کو نہایت اختصار کے ساتھ مذہب شیعہ کی سب سے معتبر

کتاب کافی سے انتقاط کر کے لکھتا ہوں جو محمد بن یعقوب کلینی بغدادی متوفی ۳۲۹ھ کی تالیف ہے اور شیعوں میں اس کی صحت و مقبولیت کا وہی درجہ ہے جو سنّیوں میں صحیح بخاری کا ہے ۔

ابو حمزہ کہتے ہیں کہ امام جعفر نے فرمایا کہ اللہ کی بندگی وہی کرتا ہے جو اس کی معرفت رکھتا ہے اور جو معرفت نہیں رکھتا وہ یوں ہی گمراہی سے اس کا پرستار بنا ہوا ہے ۔ میں نے پوچھا کہ معرفت الٰہی کیا ہے ؟ فرمایا اللہ عزوجل کی تصدیق حضرت علی کی موالات اور ان کی پیروی ائمہ ہدیٰ علیہم السلام کی پیروی اور ان کے دشمنوں سے اللہ کے سامنے برات ۔ یہ ہے اللہ کی معرفت ۔ امام رضا نے کہا کہ جملہ انسان اطاعت میں ہمارے غلام ہیں اور دین میں ہمارے محب ۔

امام ابو جعفر نے فرمایا ہم علم الٰہی کے خزانے دار ہیں اور وحی الٰہی کے ترجمان ۔ جو لوگ زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے ہیں ان سب پر ہم اللہ کی حجت ہیں ۔

امام رضا سے ایک طویل کلام ائمہ کی توصیف میں مروی ہے جس میں یہ فقرے بھی ہیں ۔

امام گناہوں سے پاک اور عیبوں سے بری ہوتا ہے ۔ علم کے ساتھ مخصوص اور حلم کے ساتھ موصوف ... لوگوں نے سخت غلطی کی اور جھوٹ گھڑا کہ جان بوجھ کر اہل بیت کو چھوڑا ۔ اور اللہ و رسول کے انتخاب کیے ہوئے سے منہ موڑا ۔ نسک و زہد علم و عبادت ۔ تقدیس و طہارت کے معدن رسول کی دعاؤں میں مخصوص اور بتول مطہرہ کی اولاد ۔

امام ابو جعفر نے فرمایا ہم شجر نبوت ہیں اور رحمت کا گھر ۔ حکمت کی کنجیاں ہیں اور علم کے معدن ۔ رسالت کا موضع ہیں اور ملائکہ کی آمد و رفت کا مقام ۔ اللہ کے بندوں کے پاس ہم اس کی امانت ہیں ۔ ہم اس کے حرم

اکبر ہیں اور ہم اللہ کا ذمہ اور اس کا عہد ہیں۔ جس نے ہمارا عہد پورا کیا اس نے اللہ کا عہد پورا کیا اور جس نے ہمارا عہد توڑا اس نے اللہ کا عہد توڑا۔"

"ائمہ کے پاس وہ ساری کتابیں ہیں جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئیں اور وہ ان سب کو باوجود زبانوں کے اختلاف کے سمجھتے ہیں۔ پھر اللہ نے ائمہ کو اس کتاب کا وارث بنایا جس میں ہر شئے کی تشریح ہے مکمل قرآن سوائے ائمہ کے کسی کے پاس نہیں اور وہ اس کا پورا علم رکھتے ہیں۔ جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ اس نے پورا قرآن جمع کر لیا وہ جھوٹا ہے۔ کسی نے اس کو جس طرح پر وہ نازل ہوا نہ جمع کیا نہ حفظ کیا سوائے علی بن ابی طالب اور ان ائمہ کے جو ان کے بعد ہیں۔ ائمہ کے پاس اسم اعظم ہے اور وہ جفر بھی رکھتے ہیں جو چمڑے کا ایک تھیلا ہے جس میں انبیاء اور اوصیاء نیز گزشتہ علماء بنی اسرائیل کے علوم ہیں۔ ان کے پاس مصحف فاطمہ ہے جو تمہارے قرآن سے تین گنا ہے اور اس میں تمہارے قرآن کا ایک حرف بھی نہیں ہے۔"

"اللہ عزوجل کے دو علم ہیں۔ ایک وہ جس کو سوائے اس کے کوئی نہیں جانتا۔ اور ایک وہ جس کو اس نے ملائکہ اور انبیاء کو سکھلایا۔ اس کو ہم جانتے ہیں۔"

"ائمہ جب کسی شئے کا علم چاہتے ہیں تو اللہ ان کو بتلا دیتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ کب مریں گے اور جب مرتے ہیں تو اپنے اختیار سے مرتے ہیں۔"

"جو کچھ ہوا یا ہونے والا ہے ائمہ سب کا علم رکھتے ہیں اور ان کے سامنے کوئی چیز مخفی نہیں رہتی۔ اللہ نے رسول کو کوئی علم نہیں سکھلایا مگر یہ کہ ان کو حکم دیا کہ امیر المومنین علی کو سکھا دیں۔ اس لیے وہ علم میں نبی کے شریک تھے۔ پھر یہ علم ائمہ کو ملا۔"

"اللہ نے ائمہ کی اطاعت کا حکم دیا ہے اور ان کی نافرمانی سے منع کیا ہے۔ وہ بمنزلہ رسول کے ہیں بجز اس کے کہ نبی نہیں ہیں"۔

"ہر امام اپنے بعد آنے والے امام کو کتابیں، علوم اور اسلحہ سپرد کر دیتا ہے۔ اور ائمہ کوئی کام بلا حکم اور بلا عہد الٰہی نہیں کرتے اور اس کے حکم سے ذرا بھی آگے قدم نہیں بڑھاتے"۔

"اللہ و رسول نے ہر ایک امام کی یکے بعد دیگرے تصریح کر دی ہے، ہر امام اپنے بعد کے امام کو امامت سپرد کرتا ہے اور اس کے لیے ایک ملفوف کتاب اور پاک وصیت نامہ چھوڑ جاتا ہے جس میں آدم کی تخلیق سے لے کر فنائے عالم تک جو حوادث پیش آنے والے ہیں سب کا حل ہے۔ امام کے لیے غیبت بھی ہے۔ جب اس کے غیبت کی خبر سنو تو انکار نہ کرو۔ اور بارہویں امام غائب ہیں۔ وہی مہدی ہیں جو روئے زمین کو جب کہ وہ ظلم و ستم سے بھر جائے گی عدل و انصاف سے بھر دیں گے"۔

"جو شخص امامت کا اہل نہ ہو اور اس کا دعویٰ کر بیٹھے وہ کافر ہے"۔

"امام ابوجعفر سے مروی ہے کہ اللہ نے کہا ہے کہ جو رعیت امام ظالم کی تابع ہو گی جو اللہ کی طرف سے نہ ہو اگرچہ اپنے اعمال میں نیک اور پرہیزگار ہو گی میں اس کو عذاب دوں گا اور جو رعیت اسلام میں امام عادل کی تابع ہو گی جو اللہ کی طرف سے ہو اگرچہ بدکار اور گنہگار ہو گی میں اس سے درگزر کروں گا[۱]۔

"امام کو امام ہی غسل (میت) دیتا ہے"۔

"امام جعفر نے فرمایا" اللہ جب کسی امام کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو ایک

---

[۱] اللہ کا یہ قول قرآن میں تو کہیں نہیں ہے۔

فرشتہ بھیجتا ہے جو عرش کے نیچے سے شربت لے کر اس کو پلاتا ہے وہ چالیس دن تک ماں کے شکم میں کوئی کلام نہیں سنتا۔ جب اس کی پیدائش ہوتی ہے تو وہی فرشتہ جس نے شربت پلایا تھا اس کے دائیں بازو پر آکر لکھتا ہے " وتمت کلمة ربک صدقاً وعدلاً لا مبدل لکلماتہ (تیرے رب کا کلمہ سچائی اور عدل کی رو سے پورا ہے اس کو کوئی بدلنے والا نہیں) جس وقت وہ امام اپنے منصب پر پہنچتا ہے اللہ ہر ملک میں اس کے لیے ایک منارہ کھڑا کر دیتا ہے جس کی روشنی میں وہ تمام بندوں کے کام دیکھتا ہے۔"

"فرشتے اماموں کے گھروں میں آتے ہیں۔ ان کے فرش پر بیٹھتے ہیں۔ اور ان کے پاس خبریں لاتے ہیں۔ لوگوں کے پاس وہی بات حق ہے جو امام کے ذریعے سے ملی ہو۔ اور جو بات امام کے ذریعے سے نہ ملی ہو وہ باطل ہے۔"

"ساری زمین امام ہی کی ہے۔ یہ اہل بیت ہیں جن کو اللہ نے زمین کا وارث بنایا ہے۔"

"مال غنیمت کا خمس چھ حصّوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ اللہ۔ رسولؐ قرابت دار۔ یتمیٰ۔ مساکین اور مسافر۔ ان میں سے پہلے تین حصّے امام کے ہیں۔ اس لیے امام کا حصہ خمس میں سے نصف یعنی کل مالِ غنیمت کا دسواں حصہ ہوتا ہے۔ مال فیئے (غنیمت بلاجنگ) نیز جنگل۔ معادن اور سمندر وغیرہ اکیلے امام کے ہیں۔"

میں نے ائمہ اہل بیت کی تعلیمات اور ان کے دعاوی میں سے یہ تھوڑی سی باتیں لی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان اقوال کو وہی تسلیم کر سکتا ہے جو ان ائمہ پر ایمان رکھتا ہو، ورنہ یہ سب کے سب بخط مستقیم قرآن کے خلاف ہیں اور غالباً اسی احساس کی بنا پر

اس قرآن کو جس پر امت ایمان رکھتی ہے ناقص قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے اور کامل قرآن ائمہ کے پاس محفوظ بتایا گیا ہے پھر اس کے علاوہ مصحف فاطمہ بھی ان کے ہاتھوں میں ہے جو اس قرآن سے تگنا اور تعلیمات کے لحاظ سے بالکل جداگانہ ہے۔

یہ دعاوی اگرچہ مذہبی رنگ میں ہیں لیکن اہل نظر سمجھ سکتے ہیں کہ یہ سب کے سب استحقاق خلافت کے سیاسی منصوبے کے اردگرد چکر کاٹ رہے ہیں اور ان کا اصل مقصود صرف اپنی کھوئی ہوئی حکومت حاصل کرنے کے لیے اُمت کو ہموار کرنا ہے۔ اور حکومت بھی علی الاطلاق !!

اہل سنت کی نگاہ میں خلیفہ بھی دوسرے انسانوں جیسا انسان ہے۔ انھیں کی طرح پیدا ہوتا ہے۔ پرورش پاتا ہے اور سیکھتا ہے۔ اس کو دوسرے مسلمانوں پر کوئی فضیلت نہیں سوائے اپنی ذاتی لیاقت کے جس کی وجہ سے اس کا انتخاب ہوا۔ نہ اس پر وحی آتی ہے نہ اس کا تسلّط روحانی ہے۔ وہ صرف قانون الٰہی کو نافذ کرنے کا مجاز ہے اور اس پر امت کو احتساب کا حق ہے۔ بلکہ غلط روی پر معزول کر دینے کا بھی۔

اور شیعوں کا امام تو اپنی سرشت و فطرت میں انسانوں سے بالاتر ہے۔ ماں کے پیٹ ہی میں عرش کے نیچے سے شربت کا پیالہ پینے لگتا ہے تشریع کا حق رکھتا ہے اس پر تنقید گمراہی ہے۔ اس کا قول و فعل حق و باطل اور خیر و شر کا معیار ہے۔ وہ ایسا روحانی رہنما ہے کہ نماز۔ روزہ وغیرہ دینی اعمال بھی بلا اس پر ایمان لائے ہوئے بیکار ہیں۔

یہ باتیں قرآن کی حسین و جمیل۔ سادہ و بسیط۔ فطرتی و جمہوری تعلیمات کے بالکل متضاد ہیں جو تمام بنی نوع انسان کو ایک ہی ماں باپ کی اولاد کہتا ہے۔ اور نسبی بنیاد پر کسی کو کوئی حق نہیں دیتا۔ نہ پیدائشی طور کسی انسان کی دینی فضیلت کو مانتا۔ نہ صلاح و تقوے کی وراثت کا قائل ہے بلکہ ہر شخص کی قیمت کا مدار خود اس کے ایمان اور عمل پر رکھتا ہے۔ چنانچہ صدر اول کے لوگ ان باتوں سے جو ان ائمہ سے مروی ہیں بالکل

ناآشنا تھے۔ خود حضرت علی اور حسین بھی خلیفہ یا امام کے متعلق وہی سادہ نظریہ رکھتے تھے جو اہل سنّت کا ہے۔ نہ اس کو معصوم سمجھتے تھے نہ تنقید سے بالاتر۔ چنانچہ اسی کافی میں روایتیں ہیں۔ حضرت علی نے فرمایا۔

لاتکفوا عن مقالۃٍ بحق اومشورۃٍ بعدل فانی لست آمن ان اخطی

(سچی بات یا انصاف کے مشورہ سے نہ رُکو کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ کوئی غلطی نہ کر بیٹھوں)

نیز امام حسین اپنے بھائی امام حسن کی صلح کو جو انھوں نے معاویہ کے ساتھ کی تھی۔ ناپسند کرتے تھے اور کہا کرتے تھے۔

لوجُزَّ انفی کان احبَّ الی مما فعلہ اخی (اگر میری ناک کاٹ لی جائے تو میں اس کو اس سے بہتر سمجھوں گا جو میرے بھائی نے کیا۔)

بعض مورخوں کا خیال ہے کہ جب سے ایرانی اس جماعت میں شامل ہوئے جو اپنے بادشاہوں کے تقدس اور خطا سے بالاتر ہونے کا خیال رکھتے تھے۔ اس وقت سے یہ باتیں شیعیت میں داخل ہوئیں۔ اور بعض یہ کہتے ہیں کہ جب سے عباسی تخت خلافت پر آگئے۔ اُس وقت سے علویہ میں اپنے حق کے احساس کی تلخی بڑھ گئی اور وہ قرابت قریبہ کی خصوصیت کی بنا پر اپنی فضیلت اور عظمت کو زیادہ زور کے ساتھ پیش کرنے لگے۔ خلیفہ منصور کے نام نفس زکیہ کا خط پہلے آپ پڑھ چکے ہیں۔ اسی زمانے کی دوسری عظیم الشان شخصیت امام جعفر کی ہے۔ انھیں سے بیشتر روایتیں مروی ہیں۔ مگر میرے نزدیک ان روایات کا انتساب ہی ائمہ اہل بیت کی طرف مشکوک ہے۔ کیونکہ شیعہ کی پہلی کتاب یہی کافی ہے جو چوتھی صدی ہجری میں مدوّن ہوئی۔ اس مدت مدید میں شیعہ راویوں کے لیے ان روایات میں تغیر و تبدّل بلکہ اضافہ اور الحاق کا پورا موقع تھا لیکن چونکہ شیعہ ان روایات کو صحیح مانتے اور ان کے اوپر عقیدہ رکھتے ہیں اس لیے تاریخی حیثیت سے مجکو اپنے کلام کی بنیاد ان کے مسلمات پر رکھنی پڑی۔

ورنہ میں اس کو بالکل نظر انداز کر دیتا۔

دیگر شیعی عقائد

مہدی منتظر کے عقیدے کی طرف ضمناً اشارہ ہو چکا ہے۔ یہ عقیدہ شیعوں سے پیدا ہوا اور اس کی اتنی اشاعت ہوئی کہ سنیوں میں بھی مقبول ہو گیا۔ اگرچہ بخاری و مسلم جو اہل سنت میں حدیث کی سب سے زیادہ صحیح کتابیں تسلیم کی گئی ہیں مہدی کی روایتوں سے خالی ہیں مگر ترمذی۔ ابوداؤد اور ابن ماجہ وغیرہ نے ان کو لیا ہے۔ ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ آخری زمانے میں اہل بیت سے ایک شخص کا ظہور ہوگا جس کی پیروی ساری امت کرے گی اور وہ اسلامی ممالک پر تسلّط حاصل کر کے دین اور عدل پھیلائے گا۔

ان روایات کے اسناد میں بعض بزرگوں خاص کر ابن خلدون نے بسط کے ساتھ کلام کیا ہے اور سب کو ضعیف یا موضوع قرار دیا ہے۔ مگر شیعہ کے یہاں یہ عقیدہ ارکان دین میں داخل ہے۔

بعضوں کے نزدیک اس کا اصلی سبب یہ ہوا کہ کربلا کے حادثے کے بعد جب اہل بیت کی خلافت کی امید منقطع ہو گئی اس وقت رؤسا شیعہ نے اس مایوسی کو دور کرنے اور جماعت کو زندہ رکھنے کے لیے مہدی غائب کا عقیدہ پھیلایا اسی زمانے میں ابوسفیان کی شاخ سے خلافت نکل کر مروان کے ہاتھ میں چلی گئی علویہ کی تقلید میں خالد بن یزید نے جس کو اپنے گھر سے خلافت نکل جانے کا سخت قلق تھا سفیانی کا خیال پیدا کیا یعنی ایک شخص اس خاندان کا ظاہر ہو کر ابوسفیان کی اولاد میں خلافت کو واپس لائے گا۔ یہ روایتیں کتب حدیث میں ہیں۔ عباسیہ نے اپنے دور میں جب دیکھا کہ علوی اور اموی دونوں گھرانوں میں ایک ایک آنے والے مہدی کا خیال ہے تو عباسی مہدی کی روایتیں تیار کرائیں جو طبرانی اور حاکم وغیرہ نے اپنی کتابوں میں درج کی ہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ خلیفہ منصور عباسی نے اسی خیال سے اپنے بیٹے کا نام مہدی رکھا ہو۔ ابو الفرج اصفہانی لکھتا ہے کہ مطیع بن ایاس جو خطبا میں سے تھا اس کی مہدویت کی حدیثیں تراشا کرتا تھا۔ اس طرح پر مسلمانوں کی اکثر جماعتوں میں مہدی کا عقیدہ پیدا ہو گیا جو امت کے لیے ایک زندہ عذاب اور مستقل تعزیر بن گیا۔ سلسلہ وار مدعیان مہدویت کھڑے ہونے لگے اور دونوں طرف سے مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہنے لگا۔ جہاں تک معلوم ہو سکا ہے صرف زیدیہ باوجود اس کے کہ وہ بھی شیعہ ہیں اس عقیدے سے ہمیشہ منکر رہے۔

رجعت

قرآن نے اگرچہ صاف صاف تصریح کردی ہے۔

أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّنَ الْقُرُونِ أَنَّهُمْ إِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُونَ وَإِن كُلٌّ لَّمَّا جَمِيعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُونَ ۳۲/۳۶	کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ان سے پہلے کتنی نسلیں ہم نے ہلاک کی ہیں جو ان کی طرف پلٹ کر نہیں آتی ہیں اور وہ سب کی سب ہمارے پاس حاضر رکھی گئی ہیں۔

مگر شیعہ میں مہدی کے عقیدے کے ساتھ رجعت کا بھی عقیدہ ہے یعنی ظہور کے بعد حضرت علی، حسن، حسین وغیرہ جملہ ائمہ دنیا میں دوبارہ واپس آئیں گے اور ان کے مخالفین ابو بکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ و معاویہؓ و یزید وغیرہ بھی لائے جائیں گے اور ان کو سزائیں دی جائیں گی۔ شریف مرتضیٰ نے لکھا ہے کہ ابو بکر و عمر کو مہدی کے زمانے میں ایک درخت پر سولی دی جائے گی۔

تقیہ

یہ بھی امامیہ کے عقائد کا جزو ہے۔ اس کا مطلب ہے اپنے عقیدے کو چھپائے رکھنا اور عمل سے اس کے خلاف ظاہر کرنا تاکہ کسی کو شیعیت کا شبہ نہ ہو سکے۔ کافی میں امام جعفر سے مروی ہے کہ "دین کا ۹/۱۰ حصہ تقیہ میں ہے اور جو تقیہ نہ کرے وہ بے دین ہے"

امام رضا سے کسی نے تقیہ کی بابت سوال کیا۔ فرمایا کہ "تقیہ میرا دین ہے اور میرے باپ دادا کا دین ہے۔ جس میں تقیہ نہیں اس میں ایمان نہیں" کوئی شیعہ سنیوں کے ساتھ نماز پڑھ لے تو بڑے ثواب کا مستحق ہو جاتا ہے۔ بعض ائمہ اہل بیت سے مروی ہے کہ "جس نے تقیہ سے کسی سُنّی کے پیچھے نماز پڑھ لی اس نے گویا نبی کے پیچھے نماز پڑھی"

بہت سے تاریخی واقعات کو بھی اس جماعت نے تقیہ پر محمول کیا ہے مثلاً حضرت علی نے ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کی بیعتوں میں تقیہ سے کام لیا۔ امام حسن نے معاویہ کے ساتھ تقیہ سے صلح کی۔ وغیرہ اسی تقیہ سے بعض شیعہ بظاہر سُنّی بن گئے۔ اور انھوں نے اپنے کو سُنّی علماء مثلاً ابن جریر اور ابن قتیبہ وغیرہ کے ناموں سے مشہور کر کے اپنی روایتیں اہل سنّت میں پھیلائیں۔

تبرّا

شیعہ اپنے عقیدے میں ائمہ اہل بیت کو خلافت رسول کا حقدار سمجھتے ہیں۔ اس لیے وہ خلفاء ثلاثہ خاص کر شیخین رضی اللہ عنہما کو ظالم اور غاصب قرار دیتے ہیں۔ اور ان سے نفرت اور عداوت رکھتے ہیں اور تبرّا کرتے ہیں۔ کافی میں امام جعفر صادق سے روایت ہے کہ "تین قسم کے لوگ ہیں جن سے اللہ نہ کلام کرے گا نہ ان کے گناہ بخشے گا بلکہ ان کو دردناک عذاب دے گا۔ ایک وہ جس نے امامت کا دعویٰ کیا اور اس کا اہل نہ تھا۔ دوسرا وہ جس نے اللہ کے متعین کیے ہوئے امام کا انکار کیا۔ تیسرا وہ جو خیال رکھتا ہے کہ ابوبکر و عمر میں اسلام کا کوئی شائبہ بھی تھا"

ان کے عقیدے میں سوائے شیعہ کے سارے مسلمان کافر ہیں۔ اور رسول اللہ ﷺ کے بعد بجز چند صحابہ کے (جو حضرت علی کی خلافت کے خواہاں تھے) جملہ صحابہ مرتد ہو گئے۔ انھیں وجوہات سے وہ خلفاء ثلاثہ۔ نیز ام المومنین حضرت عائشہ و حفصہ وغیرہ سے تبرّا کرتے ہیں اور اس کو قربت و ثواب کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ کافی کی روایات میں ان حضرات

پر لعنت بھیجنے کے لیے خاص خاص ماثورہ دعائیں ہیں۔

جماعت شیعہ

شروع میں حضرت علی کی خلافت کے خواہاں جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں چند مخلص اور نیک دل صحابہ تھے۔ پھر رفتہ رفتہ ان کے حامیوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ سبائی تحریک نے جس قدر حضرت عثمان کے مخالف پیدا کیے اُسی قدر حضرت علی کے طرفدار۔ واقعۂ کربلا سے بھی بنی امیہ کی طرف سے بہت سے دلوں میں نفرت پیدا ہو گئی جو اہل بیت کے حامی بن گئے۔ نومسلم عجمی قومیں جو بنی امیہ کے استکبار و استبداد سے تنگ تھیں اپنی فروتری کو دیکھ کر اس جماعت میں شریک ہو گئیں کیونکہ یہ بنی امیہ کے مخالف تھے۔ ایرانی امرار درؤسا ار اس خیال سے ان ائمہ کے حامی ہو گئے کہ ان کے یہاں سلطنت کی وراثت شاہی نسل میں چلتی تھی۔ حکومت الٰہی ان کی سمجھ میں نہ آسکی اور انھوں نے رسول اللہ کو بھی کسریٰ خیال کیا جن کے بعد ان کی نظر میں ان کی جانشینی کے حقدار صرف ان کے اہل بیت ہو سکتے تھے۔

الغرض مختلف اسباب سے مختلف جماعتیں اس فرقے میں شامل ہوئیں جن میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جو ابن سبا کی طرح اسلام سے انتقام لینے کے لیے محبِّ اہل بیت بن گئے تھے۔

شیعہ پر سختیاں

خوارج اور شیعہ دونوں اس بارے میں متفق تھے کہ بنی امیہ اور بنی عباس ظالم اور غاصب ہیں۔ اگرچہ دونوں کی عداوت کے اسباب مختلف تھے۔ خوارج ان کی خلافت کو اس لیے ناجائز سمجھتے تھے کہ وہ حکومت الٰہی نہ تھی بلکہ شخصی اور استبدادی سلطنت تھی اور شیعہ اس لیے کہ انھوں نے ان کے ائمہؑ کا حق غصب کر کے ان کو خلافت سے محروم کر دیا تھا اور خود اس پر قابض ہو گئے تھے۔ اس وجہ سے دونوں

فرقے ان کے دشمن تھے اور ان کے تسلّط کو مٹانا چاہتے تھے۔

خوارج اپنے عقیدے کا اظہار کر کے کھلے میدان میں مقابلہ کرتے تھے جس کے باعث خلفاء کو آسانی ہوئی کہ قوت سے رفتہ رفتہ ان کو فنا کر دیا۔ لیکن شیعہ کے پاس تقیہ کا حربہ تھا۔ وہ جب موقع پاتے کھلے میدان میں لڑتے ورنہ تقیہ کے نقاب میں روپوش ہو جاتے۔ اس وجہ سے ان کا مٹانا آسان نہ تھا چنانچہ باوجود تمام سختیوں کے کبھی آخر کار یہ زندہ رہ گئے۔ غالباً یہی علت تھی جو ائمہ اہل بیت اپنے معتقدوں کو تقیہ کی سخت تلقین اور تاکید کیا کرتے تھے اور اس کو دین کا ۹/۱۰ حصہ کہتے تھے۔

بنی امیہ نے ابتدا ہی سے ان پر سختی شروع کی۔ امیر معاویہ نے اپنے تمام عمّال کو حکم بھیجا کہ جو شخص حضرت علی اور ان کے اہل بیت سے تولّا رکھے یا ان کے مناقب روایت کرے اس کا نام وظائف کے دفتر سے کاٹ دو اور اس کی شہادت ساقط الاعتبار کر دو صرف شیعہ عثمان کو اپنے پاس آنے دو اور ان کے فضائل میں جو روایتیں بیان کی جائیں ان کو مع ان کے راویوں کے ناموں کے مجھے بھیجتے رہو۔

کوفہ شیعوں کا مرکز تھا جس کا عامل زیاد تھا۔ وہ چونکہ حضرت علی کے زمانے میں شیعہ رہ چکا تھا اس وجہ سے اس جماعت کے لوگوں سے واقف تھا۔ اس نے جہاں جہاں ان کو پایا قتل کیا۔ اس کے بعد جو کچھ رہ گئے ان کو اس کے بیٹے عبیداللہ بن زیاد نے ختم کیا ان دونوں باپ بیٹوں نے ان کو کھجوروں کے درختوں پر لوگوں کی عبرت کے لیے سولیاں دیں۔ ہاتھ اور پاؤں کاٹے۔ آنکھوں میں سلائیاں پھیریں اور ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر مارا۔ حجاج بن یوسف جب عراق کا والی ہوا تو اس نے بھی وہی برتاؤ رکھا۔ اس کو کافر یا زندیق سے اتنی نفرت نہ تھی جتنی شیعہ سے تھی۔ عربی کے مشہور ادیب اَصمعی کے دادا نے ایک دن اس سے کہا کہ میرے والدین نے میرے اوپر بڑا ظلم کیا۔ اس نے پوچھا کیا؟ بولا کہ میرا نام علی رکھ دیا۔ حجاج مسکرایا اور اس کو ایک ناحیہ کا عامل مقرر کر دیا۔

جملہ اموی عُمّال کا یہی حال تھا۔ وہ شیعیت کی تہمت پر بھی ہاتھ پاؤں کاٹ لیتے یا قید کر کے مال متاع ضبط اور مکان منہدم کر دیتے۔

عباسی اور بھی زیادہ اہل بیت کی طرف سے پرحذر تھے کیونکہ وہ خود ان کے شریک کار رہ چکے تھے۔ اس وجہ سے ان کے عہد میں شیعوں پر اور بھی سختیاں بڑھ گئیں۔ ابومسلم خراسانی نے سینکڑوں سپاہی اسی لیے مقرر کر رکھے تھے کہ جہاں کسی شیعہ کو پاجائیں قتل کر دیں۔ عباسی خلفاء میں سب سے زیادہ ان کا دشمن متوکل تھا۔ اس نے امام حسین کی قبر ۲۳۶ھ میں معہ تمام ملحقہ عمارتوں کے منہدم کرادی جس پر ہل چلا کر کاشت ہونے لگی[۱]۔ لیکن باوجود ان تمام سختیوں کے شیعہ اپنے عقیدہ اور عمل سے نہیں ہٹے اور ان کے آخری خلیفہ مستعصم تک کبھی پنہاں کبھی آشکارا مقابلہ کرتے رہے۔

کاش یہ ساری جماعتیں سیاسی مقصد میں متحد ہوتیں اور سُنّی، خارجی اور شیعہ سب اسلام کو پیش نظر رکھتے اور ایک دوسرے کو مٹانے کی کوشش میں اپنی قوتیں برباد نہ کرتے تو آج اسلام کی تاریخ ہی کچھ اور ہوتی۔ یہ قریشی خانوادوں کی حکومت کا سودا تھا جس نے ہیجان برپا کیا۔ اور ان کی باہمی رقابتوں نے امّت کا شیرازہ بکھیرا۔ ورنہ مسئلہ نہایت سادہ اور صاف تھا کہ خلافت کا مدار انتخاب عام پر رکھ دیا جائے۔ شیعہ جو امام منصوص کے قائل ہیں انھوں نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ اللہ اگر کسی کو ماں کے شکم سے خلافت کے لیے تیار کرتا تو اس کا تخت خلافت پر آجانا لازمی تھا۔ اور جب نہ آسکا تو سمجھنا چاہیئے کہ انتخاب جمہور ہی کا حق ہے۔

---

[۱] ان مظالم کی تفصیل دیکھنی ہو تو ابوالفرج اصفہانی کی کتاب مقاتل الطالبین اور ابوبکر خوارزمی کے بعض رسائل کا مطالعہ کیجیے۔

معتزلہ

اس جماعت کی ابتدا بصرہ میں ہوئی بانی واصل بن عطار تھے اور عمرو بن عبید۔ یہ دونوں موالی میں سے تھے اور امام حسن بصری کے شاگرد۔ بصرہ سے اس کی شاخ بغداد میں پہنچی بصری سلسلہ یہ ہے۔

حسن بصری

واصل بن عطا متوفی سنہ ۱۳۱ھ — عمرو بن عبید متوفی سنہ ۱۴۳ھ

واصل بن عطا: عثمان الطویل — حسن بن ذکوان

عمرو بن عبید: خالد بن صفوان — ابراہیم بن یحییٰ

عثمان الطویل: ابوہذیل علاف — ابوبکر اصم — معمر بن عباد

ابوہذیل علاف: ابراہیم نظام — ابوعلی

ابوبکر اصم: ابویعقوب

معمر بن عباد: ہشام — بشر بن المعتمر (راس البغدادین)

ابراہیم نظام: جاحظ

ابویعقوب: ابوعلی جبائی

ہشام: عباد بن سلیمان

ابوعلی جبائی کے شاگرد تھے امام ابوالحسن اشعری راس المتکلمین۔ بغدادی شاخ یہ ہے۔

بشر بن المعتمر متوفی سنہ ۲۱۰ھ

ابوموسیٰ مردار — احمد بن ابی دؤاد کردہ — ثمامہ بن الاشرس

ابوموسیٰ مردار: جعفر بن حرب

جعفر بن حرب: ابوجعفر اسکافی — عیسیٰ بن ہیثم صوفی

ثمامہ بن الاشرس: جعفر بن مبشر: ابوالحسین خیاط: ابوالقاسم بلخی

عراق متعدد اہل مذاہب کا گہوارہ تھا۔ یہودی۔ نصرانی۔ مجوسی۔ مانوی۔ زردشتی۔

صابی۔ دیصانی اور دہری وغیرہ۔ اسلامی فتوحات کے بعد جب ان میں سے لوگ مسلمان ہونے لگے اس وقت ان قوموں نے مسلمانوں کے ساتھ بحثیں شروع کیں۔ اہل علم کی ایک جماعت اسلام کی تائید اور ان کی تردید کے لیے کھڑی ہوئی۔ اس نے پہلے ان کے مذہبی حقائق کو سمجھا۔ پھر انھیں کے اصول پر ان کے جوابات دینے کی کوشش کی۔ ان میں سے بعض مذاہب مثلاً یہودیت وعیسائیت یونانی فلسفہ سے مسلح تھی۔ اس لیے اس جماعت نے اُس سے بھی واقفیت پیدا کی تاکہ ان کے اعتراضات کی مدافعت کر سکے۔ اُس کے لیے یہ بھی لازم تھا کہ عقلیت کی راہ سے ان بحثوں میں گھسے کیونکہ منقولی دلائل سے کام نہیں چل سکتا تھا۔ اس وجہ سے اس جماعت کا طریق فکر محدثوں سے الگ ہوگیا اور یہ معتزلہ کے نام سے مشہور ہوئی۔

اصول خمسہ

معتزلہ میں باہم بعض امور میں اختلافات ہیں لیکن اصل مبادی میں سب کے سب متفق ہیں اور وہ پانچ ہیں۔

۱۔ توحید ۲۔ عدل ۳۔ وعدہ و وعید ۴۔ بین بین ۵۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر

توحید ہر مسلم کا ایمان ہے لیکن اس جماعت نے اس کی مخصوص تفسیر کی۔ یعنی ذات الٰہی کو صفات سے منزہ قرار دیا۔ اس کے نزدیک قدرت۔ ارادہ۔ سمع۔ بصر۔ حیات و کلام وغیرہ صفات الٰہی جو قرآن میں بیان کیے گئے ہیں۔ بذات خود قائم نہیں ہیں ورنہ قدماء کا تعدد لازم آئے گا بلکہ عین ذات الٰہی۔ قادر سمیع اور بصیر وغیرہ ہے۔ اہل سنت صفات کو عین ذات نہیں مانتے بلکہ قائم بالذات کہتے ہیں۔

اسی طرح عدل کے بھی تمام مسلمان قائل ہیں کہ اللہ عادل مطلق ہے کسی پر ظلم نہیں کرتا لیکن معتزلہ اس میں اور آگے جاتے ہیں وہ کہتے ہیں۔

(۱) اللہ نے مخلوق کو ایک نتیجہ کے لیے پیدا کیا ہے جو اس کے لیے سرتاسر خیر ہے۔

(۲) اللہ مخلوق کے لیے نہ شر کا ارادہ کرتا ہے نہ حکم دیتا ہے۔ اسی بنا پر وہ اشیا کے حسن و قبح کو اہل سنت کی طرح شرعی نہیں بلکہ ذاتی قرار دیتے ہیں۔

(۳) انسان سے اچھے یا برے جو افعال صادر ہوتے ہیں ان کا خالق وہ خود ہے اور انسانی ارادہ افعال کی تخلیق میں آزاد ہے۔ اسی وجہ سے اس کو ان کے اوپر سزا و جزا ملتی ہے۔

وعد و وعید سے ان کی مراد یہ ہے کہ جس عمل پر جو وعدہ یا وعید ہے اس کا مترتب ہونا لازمی ہے اور ایمان صرف قلبی تصدیق کا نام نہیں ہے بلکہ ادائے واجبات بھی اس کا جزو ہے۔ اگر کوئی اللہ و رسول کو مان لے اور اعمال شرعیہ ادا نہ کرے تو مومن نہیں ہے ہر عمل خواہ فرض ہو یا نفل ایمان کا جزو ہے۔ جس قدر عمل بڑھتا ہے اسی قدر ایمان بڑھتا ہے۔ گناہ کبیرہ کا مرتکب نہ مومن ہے نہ کافر بلکہ فاسق ہے جو ان دونوں کا درمیانی درجہ ہے۔ اسی کا نام بین بین رکھتے ہیں جو ان کے الفاظ میں "منزلۃ بین منزلتین" کہا جاتا ہے۔ امر بالمعروف کو بھی فرض سمجھتے ہیں۔ لیکن خوارج کی طرح فرض عین نہیں بلکہ فرض کفایہ۔ اور خروج بالسیف اس وقت ان کے نزدیک جائز ہے جب کامیابی کی پوری امید ہو۔

ان اصول پر یہ جماعت کھڑی ہوئی پھر ان اصول سے بہت سے مسائل پیدا ہوئے جن میں دوسری اسلامی جماعتوں سے مخالفت ہوگئی۔ مگر علمی، عقلی اور ادبی لحاظ سے ان لوگوں نے اس وقت کی جملہ اسلامی جماعتوں پر نمایاں فوقیت حاصل کرلی۔ یونانی علوم نیز دیگر مذاہب کے عقائد اور ان کی تاریخوں سے بھی باخبر تھے۔ قرآن میں بھی ان کو توغل تھا۔ اگرچہ آیات کی تاویلیں اپنے اصول کے مطابق کرتے تھے۔ حدیثوں کو خواہ محدثین کے نزدیک وہ کتنی ہی قوی ہوں اپنے اصول کے خلاف پاتے تو موضوع کہہ دیتے یعنی عقل کو حدیث پر حاکم سمجھتے تھے۔ حدیث کو عقل پر نہیں بلکہ عمرو بن عبید اور ابراہیم نظام جن کی شخصیتیں ان میں نہایت ممتاز تھیں بجز قرآن اور عقل کے کسی شے پر دین کا مدار نہیں رکھتے تھے۔

صفات معتزلہ

معتزلہ عقائد میں پختہ۔ اعمال شرعیہ میں متشدد۔ روزہ نماز کے سخت پابند اور حج کے عاشق تھے۔ دین کی حفاظت، مخالفوں سے مقابلہ اور اسلامی تعلیمات کے عقلی ثبوت کو اپنا فریضہ سمجھتے تھے۔ جس مقام پر اس کی ضرورت دیکھتے گرمی یا سردی اور سفر کی مشقتوں کا خیال کئے بغیر پہنچتے۔

زبانوں میں طلاقت تھی۔ فصاحت میں ممتاز تھے اور اس زمانے کے عقلی علوم سے مسلح۔ اس لیے بحثوں میں غلبہ حاصل کرتے۔ ملحدوں۔ دہریوں اور دیگر اہل مذاہب کی تردید اور اپنے عقائد کے اثبات میں کتابیں اور رسالے لکھتے۔ اور مجامع اور مجالس میں دین کی حمایت میں تقریریں کرتے جو دل نشیں اور بلیغ ہوتیں۔ غیر مذاہب کے مجادلوں پر ان کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔

زہد و تقویٰ اور اخلاق و عادات کے لحاظ سے اس قدر مقبول تھے کہ جہاں جاتے ہزاروں آدمی ان کے ساتھ ہو جاتے۔ امت کی ہدایت اور رہنمائی یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر ان کے اصول میں داخل تھی جس کے لیے اپنے آپ کو وقف سمجھتے تھے۔ واصل بن عطاء نے اپنے خاص شاگردوں میں سے عبداللہ بن حارث کو مغرب میں حفص بن سالم کو خراسان میں۔ ایوب کو جزیرہ میں۔ حسن بن ذکوان کو کوفہ میں اور عثمان الطویل کو آرمینیہ میں بھیجا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ مقامات مذکورہ میں بڑی بڑی جماعتیں بن گئی تھیں جو امر بالمعروف کرتی تھیں۔ اور امت کا ایک طبقہ ان کے اثر میں تھا۔ خاص کر وہ لوگ جو اس وقت کی علمی تحریکوں میں حصہ لیتے تھے۔ یاقوت نے معجم البلدان میں تاہرت کے تحت میں لکھا ہے کہ یہاں واصلیہ یعنی اصحاب واصل بن عطاء کے کم و بیش تیس ہزار آدمی ہیں جو خیموں میں رہتے ہیں اور جابجا دین کی تلقین اور تبلیغ کرتے پھرتے ہیں۔

اسی قسم کی جماعتیں ان کی مغرب سے مشرق تک پھیلی ہوئی تھیں اور ان کے باہمی

تعلقات بمقابلہ دوسری اسلامی جماعتوں کے زیادہ مخلصانہ تھے۔ عقلیت کی وجہ سے توہم پرستیوں سے آزاد تھے۔ جن کے قائل تھے کہ وہ اللہ کی مخلوق ہیں مگر آیت

انہ، یراکم ہو وقبیلہ من حیث لاترونہم ۲۷	وہ اور اس کا قبیلہ دیکھتا ہے تم کو جہاں سے کہ تم ان کو نہیں دیکھتے۔

کے مطابق یہ نہیں مانتے تھے کہ وہ انسانوں کو نظر آتے ہیں۔ اس لیے ان کے بچوں نیز عورتوں میں بھوتوں اور چڑیلوں کا خوف بالکل نہ تھا۔

معتزلہ اور خلفاء

بنی امیہ کے زمانے میں معتزلہ کا حلقہ زیادہ نہیں پھیلا تھا مگر ان کی جماعت قائم ہو چکی تھی۔ خلیفہ ولید بن یزید نے جب لہو ولعب اور شراب و غنا میں وقت کو برباد کرنا شروع کیا اس وقت سب سے زیادہ اس کی مخالفت میں اسی جماعت نے حصہ لیا اور یزید ثالث کی جو ان کا ہم خیال تھا پوری امداد کی۔ یہاں تک کہ ولید مارا گیا اور یزید اس کی جگہ تخت پر آ گیا۔ بعض معتزلہ اس کو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے بھی بہتر قرار دیتے تھے۔

عباسی عہد میں عمرو بن عبید راس المعتزلہ کا ابوجعفر منصور کے دربار میں بہت عزت رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ اس پر تنقید بھی کرتا اور اس کے مظالم اس کے سامنے گنا تا منصور نے ایک دن کہا کہ یہ شاہی مُہر لو اور تم اور تمہارے ساتھی اس کام کو سنبھالو۔ اس نے کہا کہ یہیں آپ کے دروازے پر ہزار قسم کے مظالم ہیں۔ پہلے ان کو دور کیجیے پھر ہم کو بلا یے تو ہم سمجھیں گے کہ آپ سچے دل سے بُلا رہے ہیں۔

محمد (نفس زکیہ) نے اپنے خروج سے پہلے عمرو کو خط لکھا تھا جس میں غالباً اس سے نصرت چاہی تھی۔ منصور کو اس کا پتہ لگ گیا۔ عمرو سے پوچھا کہ کیا تمہارے پاس محمد کا کوئی خط آیا ہے؟ کہا کہ ایک خط آیا ہے جو انھیں کے خط سے ملتا جلتا ہے۔ پوچھا پھر کیا جواب دیا؟ بولا کہ تم کو میری رائے معلوم ہے کہ میں مسلمانوں میں تلوار کے استعمال کو جائز نہیں سمجھتا۔

کہا۔ ہاں لیکن قسم کھاؤ۔ اس نے کہا کیا فائدہ۔ میں نے اگر تقیہ سے کہا ہے تو تقیہ سے قسم بھی کھالوں گا منصور نے کہا نہیں نہیں تم بالکل سچے ہو۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اگرچہ منصور کی خلافت سے بیزار تھا لیکن اس کے خلاف تلوار اُٹھانا جائز نہیں سمجھتا تھا۔ اور یہی بات تھی جس کی وجہ سے خلفاء عباسیہ نے معتزلہ کو سیاسی حیثیت سے کبھی نہیں چھیڑا کیونکہ یہ لوگ ان کے حامی نہ تھے تو ان کے دشمنوں کے بھی حامی نہ تھے۔

منصور نے اس سے اپنی تائید کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے انکار کر دیا۔ دروازے پر ابو ایوب موریانی وزیر ملا اور کہا کہ تم نے خلیفہ کو مایوس کر دیا۔ عمرو نے کہا کہ تم کس لیے ہو؟ اس کی مدد کرو۔ ملت کی بدنصیبی ہے کہ اس کے مہمات تم جیسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں۔

ہارون الرشید کے عہد میں ان کا زور کم رہا۔ کیونکہ وہ ان کے جدلیات کو ناپسند کرتا تھا۔ اور اس نے حکم دے رکھا تھا کہ عقائد میں بحثیں نہ کی جائیں لیکن اس کے بیٹے مامون الرشید نے جب اعتزال کو اختیار کیا اس وقت معتزلہ کا ستارہ چمک اٹھا جو معتصم اور واثق کے زمانوں میں عروج پر رہا اور متوکل کے زمانے میں ڈوب گیا۔

مامون عباسی

مامون جب مرو سے ۲۰۴ھ میں بغداد میں آیا تو اس نے اپنے علمی ذوق کی وجہ سے قاضی القضاۃ یحییٰ بن اکثم کو حکم دیا کہ پایۂ تخت کے علماء کو دربار میں لائیں۔ انھوں نے مختلف جماعتوں کے چالیس علماء چن کر حاضر کیے۔ مامون نے مجلس مناظرہ قائم کی جو ہر منگل کے دن منعقد ہوتی۔ اس میں وہ خود بھی شریک ہوتا اور ہر ہر فرقہ کے اہل علم آزادی کے ساتھ بحث کرتے یہاں تک کہ امامیہ اور زیدیہ بھی مسئلہ امامت پر بے باکی کے ساتھ دلیلیں لاتے اور معتزلہ اپنے عقائد کا ثبوت پیش کرتے۔

اس سے پہلے اصحابِ حدیث کے غلبہ کی وجہ سے کوئی شخص علانیہ کسی امر میں ان کی مخالفت کی جرأت نہیں کرسکتا تھا لیکن اس مجلس مناظرہ نے اس کا راستہ کھول دیا۔

مامون کا مقصد غالباً یہ تھا کہ باہمی مناظرات سے اختلافات مٹ جائیں گے اور تمام فرقے ہم خیال ہوکر متحد ہوجائیں گے لیکن نتیجہ بالکل برعکس نکلا کیونکہ اس نے خود اپنے آپ کو ان بحثوں سے بالاتر نہیں رکھا بلکہ معتزلہ کی تائید کی۔ خاص کر مسئلہ خلق قرآن میں۔ اس وجہ سے محدثین اور فقہا اور ان کے اثر سے جمہور اہل سنّت اس کے مخالف ہوگئے اور یہی اور صرف یہی ایک مسئلہ تھا جو اعتزال کی تباہی کا موجب ہوا۔ اس لیے اس کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت ہے۔

فتنہ خلق قرآن

معتزلہ نے جب تنزیہ ذات اور نفی صفات کا عقیدہ نکالا اس وقت اس بحث کے سلسلہ میں ذات باری سے صفت کلام کی نفی کے بعد قرآن کے مخلوق یا غیر مخلوق ہونے کی بحث درمیان میں آئی۔ سب سے پہلے دوسری صدی ہجری کے آغاز میں جعد بن درہم نے قرآن کے مخلوق ہونے کا دعویٰ کیا پھر جہم بن صفوان نے اس کی پیروی کی محدثین نے اس قول کو اسلام کے خلاف قرار دیا۔ چنانچہ جعد کو خالد بن عبداللہ قسری والی عراق نے عید اضحیٰ کے دن بطور قربانی کے ذبح کیا[1]۔ اور جہم کو سلمہ بن احوز نے مرو میں قتل کر ڈالا لیکن اس خیال کے پیرو باقی رہ گئے اور جہم کی نسبت سے ان کی جماعت فرقہ جہمیہ کے نام سے موسوم ہوئی۔

---

[1] خالد نے جعد کو بربنائے تعصب قتل کیا تھا۔ غالباً اسی انسانی قربانی دینے کی سزا اس کو یہ ملی کہ ولید بن یزید جب خلیفہ ہوا تو اس نے اس جرم پر کہ خالد نے اس کو ولی عہدی سے نکلنے میں ہشام کی موافقت کی تھی اس کو اس کے جانی دشمن یوسف بن عمر ثقفی والی عراق کے حوالہ کر دیا۔ یوسف نے خالد کو شکنجہ میں کس کر اس کے سینے کو رسی سے رسیت ڈالا۔ یہاں تک کہ وہ ہلاک ہوگیا۔

مامون الرشید کے زمانہ میں اس مسئلہ نے بہت اہمیت اختیار کرلی کیونکہ خود وہ اور اس کے درباری علماء اسی خیال کے ہو گئے۔ اب انھوں نے محدثین کے خلاف قوت سے کام لینا شروع کیا۔ بہت سے محدثوں کو کافر قرار دے کر قتل کیا۔ اور سینکڑوں کو قید کی سزائیں دیں اور ابتلا و امتحان میں ڈال کر اذیتیں پہنچائیں۔ اکثر علماء نے مجبوراً قرآن کو مخلوق کہہ کر اپنی جانیں بچالیں مگر امام احمد بن حنبل اس ابتلا میں ثابت قدم رہ گئے ۲۱۸ھ میں جبکہ مامون طرسوس میں تھا اس کے حکم سے اسحاق بن ابراہیم امیر بغداد نے امام احمد کو بیڑیاں پہنا کر سپاہیوں کی حراست میں اس کے پاس روانہ کیا۔ مقام رقّہ میں پہنچے تھے کہ مامون کے مرنے کی خبر آگئی۔ اس لیے پھر بغداد میں واپس لاکر قید کر دیے گئے۔

مامون اپنے بھائی معتصم کو جو اس کا جانشین ہوا سخت تاکید کر گیا تھا کہ میرے بعد کوشش کر کے اس "مشرکانہ" عقیدے کو مٹا دینا۔ بھائی کی وصیت نیز احمد بن دواد راس الاعتزال کے اثر سے جو یحییٰ بن اکثم کی جگہ قاضی القضاۃ بھی تھا اور وزیر بھی معتصم نے ۲۲۰ھ میں مجلس مناظرہ منعقد کی۔ امام احمد بن حنبل پا بجولاں لائے گئے۔ خلیفہ اور وزیر دونوں جاہ و جلال کے ساتھ جلوس فرما تھے۔ دیگر علماء معتزلہ بھی جمع تھے۔ قضاۃ فقہا۔ امرا و روٴسا سے دربار بھرا ہوا تھا۔ وہ معتصم کے سامنے بٹھائے گئے۔

معتصم۔ قرآن کی بابت کیا کہتے ہو؟

امام احمد۔ کوئی آیت یا روایت پیش کی جائے اس کے مطابق کہنے کو تیار ہوں۔

ایک معتزلی۔ قرآن میں ہے "ما یاتیہم من ذکر من ربہم محدث" کیا محدث مخلوق نہیں ہے؟

امام۔ قرآن کے لیے الذکر کا لفظ آیا ہے۔ الف لام کے ساتھ اس آیت میں ذکر بغیر الف لام کے ہے اس سے قرآن مقصود نہیں[1]۔

---

[1] امام موصوف کا یہ جواب صحیح نہیں ہے۔ آیات میں بلا الف لام کے بھی ذکر کا لفظ قرآن کے لیے استعمال ہوا ہے مثلاً سورۂ طلاق میں ہے "قد انزل اللہ الیکم ذکرا" غالباً اسی وجہ سے اپنے (اگلے صفحہ پر)

دوسرا معتزلی۔ قرآن میں ہے "اللہ خالق کل شیئ" کیا قرآن شیئ نہیں ہے؟

امام۔ اللہ نے اپنے لیے قرآن میں کئی جگہ نفس کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مثلاً "کتب علی نفسہ الرحمۃ" پھر فرماتا ہے "کل نفسٍ ذائقۃ الموت" کیا تمھارے خیال میں نفس الٰہی کے لیے بھی موت ہے؟

تیسرا معتزلی۔ عمران بن حصین رضؓ سے روایت ہے کہ "ان اللہ خلق الذکر"

امام۔ اس روایت کا صحیح لفظ ہے "ان اللہ کتب الذکر"۔

چوتھا معتزلی۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے "ما خلق اللہ من جنۃٍ ولا نارٍ ولا سماءٍ ولا ارضٍ اعظم من آیۃ الکرسی۔

امام۔ خلق کا فعل جنت۔ نار۔ سماء اور ارض سے متعلق ہے نہ کہ آیۃ الکرسی سے

پانچواں معتزلی۔ کلام اللہ کو غیر مخلوق کہنے سے اس کی مشابہت اللہ کے ساتھ لازم آتی ہے۔

امام۔ اللہ احد ہے صمد ہے۔ نہ کوئی اس کا شبیہ ہے نہ عدیل۔ لیس کمثلہ شیئ۔

معتصم۔ ہاں تو کیا کہتے ہو؟

امام۔ کوئی آیت یا روایت دیجیے تو اس کے مطابق کہوں۔

ایک معتزلی نے عقلی دلائل پیش کرنے شروع کیے۔

امام۔ میں اس کو نہیں جانتا۔ یہ نہ روایت ہے نہ آیت۔

معتزلی۔ خلیفہ سے مخاطب ہو کر۔ امیر المومنین! جب ان کو کوئی دلیل نظر آتی ہے تو

بقیہ ۱۲۲ کا:۔ رسالہ رد جہمیہ میں انھوں نے اس کا دوسرا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ ذکر میں وہ ذکر بھی ہے جو اللہ کی طرف سے نازل ہوتا ہے۔ اور وہ ذکر بھی ہے جو رسول کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ محدث کا لفظ اسی دوسرے ذکر کے بارے میں ہے۔ جہاں قرآن مراد ہوگا وہاں محدث یا مخلوق کا لفظ بولنا صحیح نہ ہوگا۔ لیکن یہ جواب بھی محض تکلف اور تحکم ہے۔ "ما یاتیہم من ذکر من ربہم" سے قرآنی آیات کسی طرح خارج نہیں کی جا سکتیں۔ اس کا صحیح جواب یہ تھا کہ قرآن بے شک محدث ہے مگر مخلوق نہیں۔ آئندہ اوراق میں ہم اس کی حقیقت واضح کریں گے۔

ہمارے اوپر جھپٹ پڑتے ہیں۔ اور جب ہم کچھ کہتے ہیں تو بول اُٹھتے ہیں کہ میں اس کو نہیں جانتا۔

احمد بن دواد۔ امیر المومنین! یہ گمراہ ہے، گمراہ کن ہے اور بدعتی۔

اس بحث کے بعد قید خانے واپس بھیج دیئے گئے۔ دوسرے دن پھر لائے گئے اور مناظرہ ہوا۔ تیسرے دن جب اہل دربار تھک کر مایوس ہو گئے اس وقت معتصم نے تازیانہ مارنے کا حکم دیا۔ مسعودی کے قول کے مطابق ۳۸ کوڑے لگائے گئے تھے کہ ان کے جسم سے خون جاری ہو گیا اور بیہوش ہو گئے۔ معتصم نے قید خانے میں بھیجدیا اور ایک طبیب مقرر کر دیا جس کے علاج سے اچھے ہوئے۔

معتصم ان لوگوں کو جو قرآن کو غیر مخلوق کہتے تھے قتل کر دیتا تھا۔ اس دن بھی جس دن امام کو دربار میں بحث کے لیے طلب کیا تھا دو شخصوں کو اسی جرم میں قتل کر چکا تھا لیکن امام موصوف کے قتل کی جرأت اس نے نہیں کی۔ جس کے حسب ذیل اسباب تھے۔

(۱) امام احمد کے ساتھ جمہور کی عقیدت بہت زیادہ تھی اس لیے وہ ڈرا کہ ان کے قتل سے فتنۂ عام برپا ہو جائے گا جس کا مٹانا نہایت دشوار ہوگا۔

(۲) معتصم خود شجاع تھا اور شجاعت کا قدر دان۔ امام موصوف کے مناظرہ سے ان کے استقلال اور ثبات قلب کا نقش اس کے دل پر بیٹھ گیا جس کی وجہ سے ان کو قتل کرنا گوارا نہ کیا۔

(۳) اس نے ان کے بشرہ سے ان کی راست بازی اور خلوص نیت کو دیکھا اور سمجھ گیا کہ وہ صرف اس وجہ سے قرآن کو غیر مخلوق کہتے ہیں کہ مخلوق کہنے کی کوئی دلیل نہیں پاتے۔

آخر کار ان کو چھوڑ دیا۔ اس کے بعد سات سال تک وہ زندہ رہا مگر پھر ان سے کچھ نہیں بولا۔ ۲۲۷ھ میں اس کے مرنے پر واثق خلیفہ ہوا۔ وہ بھی خلق قرآن کے عقیدہ کی حمایت کرتا رہا۔ یہاں تک کہ احمد بن نصر کو اس کی مخالفت پر خود اپنے ہاتھ سے قتل کیا۔

لیکن امام احمد سے کبھی کچھ تعرض نہیں کیا۔

جب متوکل خلیفہ ہوا۔ اور اس نے دیکھا کہ اس فضول فتنہ سے نہ خلافت کو کوئی فائدہ ہے نہ اُمّت کو۔ بلکہ دن بدن نفرت کی خلیج وسیع ہوتی جا رہی ہے تو ۲۳۴ھ میں تمام صوبوں میں حکم بھیجا کہ کوئی قرآن کو مخلوق نہ کہے۔ اس پر سارے ملک میں خوشی منائی گئی۔ اور لوگ جو معتزلہ کی سختیوں سے تنگ تھے خوش ہو گئے۔ بلکہ رائے عامہ ان کے خلاف اس قدر بھڑک اُٹھی کہ جمہور نے ان سے انتقام لینا شروع کیا۔ متوکل نے محدثین کی مدارت کے لیے ان کو سامرا میں بلا کر انعامات دیئے اور صفات اور رویت کی احادیث روایت کرنے کی آزادی عطا کی۔ چنانچہ ان کی مجالس میں غیر معمولی مجمع ہونے لگا۔ امام احمد بن حنبل جو اس امتحان میں پورے اتر گئے تھے محدثوں کے سردار مانے گئے۔ یہاں تک کہ یہ اصول مسلم ہو گیا کہ جس کو وہ ثقہ کہہ دیں ثقہ ہے اور جس کو ضعیف کہہ دیں ضعیف۔

لوگ متوکل کے شکریہ کے ساتھ اس کے لیے دعا رخیر کرنے لگے اور اس قدر تعریف کی کہ بعض حنابلہ نے اس بدتدبیر اور عیاش خلیفہ کو جس کے محل میں بقول ابوبکر خوارزمی بارہ ہزار حرم تھیں۔ خلفاء راشدین کے ہم رتبہ قرار دیا۔

حنبلیوں کا زور اس قدر بڑھ گیا کہ انھوں نے بغداد میں احتساب اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ معتزلہ خوف سے چھپ گئے اور جماعتی لحاظ سے ان کا وجود ختم ہو گیا۔

توضیح مسئلہ

خلق قرآن کا فتنہ جس نے نہ صرف امت بلکہ عباسی سلطنت میں تزلزل ڈال دیا تھا محض فلسفیانہ غلو اور قرآن کی ناواقفیت سے پیدا ہوا تھا۔ معتزلہ سمجھتے تھے کہ غیر مخلوق کہہ دینے سے قرآن قدیم ہو جاتا ہے جس سے قدما کا تعدد لازم آتا ہے۔ اس لیے یہ عقیدہ مشرکانہ ہے۔ لہٰذا خلیفۂ اسلام کا یہ فرض ہے کہ ایسے عقیدے کو جو توحید کے خلاف ہے قوت سے مٹائے۔ دوسری طرف محدثوں کے پاس بھی غیر مخلوق کہنے کے دلائل اتنے

واضح نہ تھے کہ معتزلہ کی تشفی کر سکتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تعصب درمیان میں آیا اور معاملہ بہت بڑھ گیا۔ محدثین کے لیے اس کے سوا کیا چارہ تھا کہ آنحضرتؐ کی حدیثیں سُنا سُنا کر عوام کے ایمان کو جوان کی قوت تھے تازہ رکھیں۔ چنانچہ متعدد حدیثیں اس مضمون کی کہ "القرآن کلام اللہ غیر مخلوق" مختلف پیرایوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی گئیں اور وعظ و تذکیر کے ذریعے سے لوگوں میں پھیلائی گئیں۔ لیکن اگر قرآن میں زیادہ غور کیا جاتا تو یہ مسئلہ بالکل واضح ہوجاتا اور روایات کی مطلق ضرورت نہ پڑتی۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ ردجہمیہ میں سورۂ اعراف کی آیت "الالہ الخلق والامر" سے یہ استدلال کیا ہے کہ خلق اور امر دو مختلف چیزیں ہیں کیونکہ قرآن میں یہ اصول عام ہے کہ جب وہ ایک ہی چیز کا مختلف الفاظ میں ذکر کرتا ہے تو ان کے درمیان فصل کے لیے واؤ نہیں لاتا۔ مثلاً سورۂ حشر میں ہے "الملک القدوس السلام المومن المھیمن العزیز الجبار المتکبر" اور جب دو مختلف چیزیں ہوتی ہیں تو ان کے درمیان واؤ عاطفہ داخل کرتا ہے جیسے سورۂ فاطر میں ہے: "وما یستوی الاعمیٰ والبصیر، ولا الظلمات ولا النور۔ ولا الظل ولا الحرور۔ وما یستوی الاحیاء ولا الاموات" سورۂ تحریم میں ایک ہی آیت میں دیکھو "ازواجاً خیراً منکن مسلمات مومنات قانتات تائبات عابدات سائحات ثیبات وابکارا" جہاں تک ایک ہی چیز کے مختلف اسماء اور صفات تھے وہاں تک بلا فصل رکھا۔ لیکن ثیبہ اور بکر دو مختلف صفتیں ہیں جن کا باہم اجتماع نہیں ہو سکتا، اس لیے ان میں واؤ لاکر فصل کر دیا۔ لہٰذا خلق کا اطلاق امر پر اور امر کا اطلاق خلق پر نہیں ہو سکتا۔ قرآن امر ہے۔ سورۂ طلاق میں ہے "ذالک امر اللہ انزلہ الیکم" اس لیے اس کو خلق نہیں کہہ سکتے۔ یہ استدلال ان کا صحیح ہے لیکن عالم امر کی مزید حقیقت ان کے اوپر منکشف نہیں تھی کہ وہ عالم خلق کی طرح حادث ہے اور محدث کا لفظ اس کے لیے بولا جا سکتا ہے۔ اس وجہ سے معتزلہ کے استدلال

"مایاتیہم من ذکر من ربہم محدث" کا ٹھیک جواب وہ نہ دے سکے۔

اصلیت یہ ہے کہ امر کا لفظ جس طرح قرآن میں جا بجا بہت سے معنوں میں مستعمل ہوا ہے اسی طرح اس کی متعدد نوعیتیں بھی قرآن سے ثابت ہوتی ہیں۔

امر تکوینی[۱] - یعنی اشیاء کی تخلیق کا حکم - سورۂ یٰسین میں ہے۔

انما امرہٗ اذا اراد شیئاً ان یقول لہٗ کن فیکون	اس کا حکم جب وہ کسی شئی (کی تخلیق) کا ارادہ کرتا ہے یہی ہے کہ اس سے کہتا ہے کہ ہو جا وہ ہو جاتی ہے،

امر تدبیری[۲] - یعنی عالم خلق کے انتظامی اور تدبیری احکام - سورۂ یونس میں ہے۔

خلق السمٰوات والارض فی ستۃ ایام ثم استوی علی العرش یدبر الامر	آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا پھر عرش پر براجا تدبیر کرتے ہوئے امر کی۔

آیت زیر بحث "الالہ الخلق والامر" میں جو امر مذکور ہے وہ تدبیری ہے۔ آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے کے بعد اللہ نے ان کے انتظام کی تدبیر کے لیے اپنے اوامر نافذ فرمائے۔ سورۂ حم سجدہ میں تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ ہم نے دو دن میں زمین پیدا کی پھر دو دن میں پہاڑ اور زمین کے جملہ اندرونی ذخیرے بنائے پھر دو دن میں ساتوں آسمان کھڑے کیے۔ اس کے بعد "اوحیٰ فی کل سماءٍ امرہا" ساتوں بلندیوں میں ان کے تدبیری اور انتظامی اوامر نافذ کیے۔ ایسا ہی ساتوں پستیوں کے متعلق سورۂ طلاق میں فرمایا۔

خلق سبع سمٰوات ومن الارض مثلہن یتنزل الامر بینہن	سات بلندیاں پیدا کیں اور ویسی ہی سات پستیاں جن میں اوامر اترتے ہیں۔

اس طرح بلندیوں اور پستیوں سب میں اوامر تدبیری نافذ ہیں۔ سورۂ سجدہ میں ہے۔

یدبر الامر من السماء الی الارض	وہ امر کی تدبیر کرتا ہے بلندی سے پستی تک

اب واضح ہوگیا کہ عالم امر عالم خلق کے بعد ہے جس کی ان آیات کے علاوہ بھی متعدد آیتوں میں تصریح ہے۔ سورہ سجدہ میں ہے۔

خلق السموات والارض وما بینھما فی ستۃ ایام ثم استوی علی العرش	پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ دنوں میں پھر عرش پر مستولی ہوا۔

عرش اسی کا نام رکھا جہاں سے اوامر تدبیری نافذ ہوتے ہیں اور جن کا نفاذ رحمت کی تجلی سے ہوتا ہے "الرحمٰن علی العرش استوی" اس لیے عرش استوار علی العرش اور تنفیذ اوامر تدبیری سب خلق کے بعد کی چیزیں ہیں اور عالم خلق اور عالم امر دونوں حادث ہیں اور دونوں کی ہر شئی پر محدث کا لفظ بولا جا سکتا ہے۔

اسی امر تدبیری کے ذیل میں امر تشریعی ہے۔ وہ بھی حادث اور محدث ہے بنی اسرائیل کے بارے میں سورۂ جاثیہ میں ہے۔

وآتیناھم بینات من الامر ۱۷/۴۵	اور ہم نے کھلی دلیلیں امر (شریعت) کی ان کو دیں۔

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی سورۂ میں خطاب ہے

ثم جعلنٰک علی شریعۃ من الامر ۱۸/۴۵	پھر ہم نے تجھکو عالم امر سے ایک شریعت پر لگا دیا۔

وحی اور کلام الٰہی اسی امر تشریعی میں داخل ہے۔ سورۂ طلاق میں ہے۔

ذالک امر اللہ انزلہ الیکم ۵/۶۵	یہ امر الٰہی ہے جس کو اس نے تمھاری طرف اتارا۔

سورۂ شوریٰ میں ہے۔

وکذالک اوحینا الیک روحاً من امرنا	ایسا ہی ہم نے تیری طرف اپنے امر کی ایک روح (قرآن) کی وحی کی۔

اس لیے قرآن جو امر تشریعی ہے حادث اور محدث ہے مگر عالم امر سے ہے۔ عالم خلق سے نہیں ہے۔ لہٰذا اس کو مخلوق کہنا قرآن کے خلاف ہے۔

فنا کے اسباب

معتزلہ کے مٹنے کے اسباب خود ان کے اصول اور اعمال میں غور کرنے سے

واضح ہو جاتے ہیں۔ اور وہ حسب ذیل ہیں۔

١۔ یہ جماعت دین میں ایمان اور عقلیت (دلائل علمی) دونوں کی راہ سے داخل ہوئی تھی اور اعتزال کے قوام ماہیت میں فلسفہ شامل تھا۔ اس وجہ سے اس کا راستہ امت سے نمایاں طور پر الگ ہو گیا۔

ایمان کے اجزاء:۔ اللہ۔ رسول۔ ملائکہ۔ کتاب۔ یوم آخر۔

اسلام کے ارکان:۔ کلمہ طیبہ۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ۔

اعتزال کے عناصر:۔ توحید۔ عدل۔ وعد و وعید۔ بین بین۔ امر بالمعروف۔

یہی وجہ تھی کہ جو پختگی محدثین کے دین میں تھی وہ معتزلہ میں نہیں پیدا ہو سکی۔

٢۔ معتزلہ اگرچہ عقلیت پرست تھے اور حدیثوں کے راویوں تابعین عظام بلکہ صحابہ کرام پر بھی بے تحاشا تنقید کرتے تھے مگر عوام کی طرح ان مذہبی جھگڑوں میں بھی حصہ لیتے تھے جو روایتوں سے پیدا ہوئے تھے۔ خاص کر ابوبکرؓ و علیؓ کی بحث میں۔ بصری جماعت کی بڑی تعداد حضرت ابوبکر کو افضل سمجھتی تھی اور بغدادی شاخ تمام تر حضرت علی کو۔ ان کی عقلیت شخصیت پرستی سے ان کو نکال نہیں سکی تھی[1]۔ یہاں تک کہ استبدادی خلافتوں کو بھی صحیح سمجھتے اور ان کے ساتھ موالات رکھتے رہے۔

٣۔ قرآن میں وہ تدبر اور تفکر کرتے تھے لیکن اس سے زیادہ تر غرض ہوتی تھی۔ اپنے مخصوص عقائد کی دلیل یا آیات اور معجزات کی تاویل۔ اس لیے قرآن کے پاس کبھی نہ پھٹک سکے اور پہلا ہی قدم جو اس میں انھوں نے رکھا غلط پڑا۔

اس کی توضیح یہ ہے کہ قرآن نے اپنی آیات کو محکمات اور متشابہات میں تقسیم کیا ہے۔ اور متشابہات کے متعلق تصریح کر دی ہے کہ ان کی تاویل اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ان کو صرف مان لینا چاہیئے۔ جو لوگ علم میں پختہ ہیں ان پر ایمان لاتے ہیں، مگر جن کے

---

[1] یہ صرف قرآن ہے جو انسان پر طاری ہو جاتا ہے تو ہر ماحول سے اس کو بالاتر لے جاتا ہے۔

دلوں میں کجی ہے وہ ان کی تاویلوں کے پیچھے پڑتے اور فتنے برپا کرتے ہیں۔ یہ متشابہات اللہ کی ذات۔ صفات۔ جنت۔ نار اور میزان عمل وغیرہ ہیں جن کا بیان تمثیل و تشبیہہ کے طور پر ہے اور جن کی حقیقت سمجھنے سے انسان اس دنیا میں قاصر ہے معتزلہ نے سب سے پہلے متشابہات ہی کو لیا اور اللہ کی ذات کو صفات سے منزہ ثابت کرنے کی کوشش شروع کی اور اسی کو اپنا اولین اصول "توحید" قرار دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسی سے خلق قرآن کا مسئلہ نکلا جس سے فتنہ برپا ہو گیا اور آخر اسی فتنے کی موجیں خار و خس کی طرح ان کو بہا لے گئیں۔

۴۔ غلطی پر غلطی انھوں نے یہ کی کہ اس فلسفیانہ عقیدہ میں عوام کو شریک کرنا چاہا۔ اور اپنی جماعت میں سے ٹولیاں بنا بنا کر اطراف ممالک میں تبلیغ کے لیے بھیجنے لگے اور کوشش شروع کی کہ اعتزال کو حکومت کا رسمی مذہب بنا دیں۔ خلیفہ مامون اور وزیر احمد بن ابی دواد دونوں ان کے ہم خیال تھے۔ اس وجہ سے کامیابی کی امید بھی قوی تھی۔

۵۔ آخر میں سب سے بڑی غلطی یہ کی کہ اس عقیدے کو اپنے حریفوں سے منوانے کے لیے قوت سے کام لیا۔ اور اس عقلیت پرست جماعت نے جس کو وسیع القلب ہونا چاہئے تھا ایسی تنگ دلی اختیار کی کہ بڑے بڑے محترم بزرگان امت کو سزائیں دلوائیں۔ قید و بند میں ڈالا اور قتل کرایا۔ آخر مکافات کے اصول نے ان کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکا۔

احمد بن ابی دواد جو مامون کے زمانے سے واثق کے عہد یعنی ۲۱۸ھ سے ۲۳۲ھ تک نہ صرف قاضی القضاۃ بلکہ عملاً وزیر بھی تھا اس تمام فتنہ کا بانی تھا۔ ۲۳۲ھ میں اس پر فالج گرا۔ متوکل نے اس کی جگہ اس کے بیٹے ابو الولید کو مقرر کیا تھا۔ پھر معزول کر دیا۔ اور دونوں باپ بیٹوں کی ساری ملکیت ضبط کر لی سخت مصیبتیں اٹھا کر نہایت

نامرادی کے ساتھ یہ دونوں ۲۳۹ھ میں مرے۔ اور امام احمد بن حنبل نے ۲۴۱ھ میں جس دن وفات پائی اس دن بغداد میں سارا کاروبار بند ہو گیا۔ ان کے جنازہ میں جس قدر خلقت تھی اس کا شمار تیرہ لاکھ سے زائد تھا اور بالاخانوں اور شہر پناہ کے اوپر مستورات کم سے کم ساٹھ ہزار تھیں۔ حنابلہ کہتے تھے۔ بیننا وبینکم یوم الجنائز (ہمارے اور تمہارے درمیان جنازہ کے دن فرق ظاہر ہوتا ہے۔)

معتزلہ کے بعد

معتزلہ اگرچہ اپنی تباہی کے ذمہ دار آپ ہیں مگر ان کے فنا ہو جانے سے امت کا عقلی اور دینی نقصان ہوا۔ محدثوں نے منقولات سے جو جمود پیدا کیا تھا اس کے مقابلے میں ان کی عقلیت نے توازن قائم کر رکھا تھا۔ ان کے مٹ جانے سے پھر وہی جمود عود کر آیا۔ اب جو لوگ علوم عقلیہ کو لے کر اُٹھے مثلاً فارابی۔ ابن رشد وغیرہ وہ محدثین کے سامنے سر نہیں اُٹھا سکتے تھے اور اسی کو غنیمت سمجھتے تھے کہ وہ ان کو اپنے افکار میں آزاد رہنے دیں۔ ان کی زندگیوں کا ماحصل فلسفہ تھا۔ اور معتزلہ دین کو ہر شے پر مقدم رکھتے تھے۔ اس لیے یہ لوگ اُن کی جگہ پُر نہ کر سکے اور متکلمین نے تو شروع ہی سے علم کلام کی بنیاد اہل سنت کے عقائد پر رکھی اور دینی لحاظ سے ہمیشہ محدثوں کے تابع رہے۔

مرجیہ

عہدِ صحابہ میں جب فتنہ برپا ہوا۔ اور مصریوں اور عراقیوں نے آکر مدینے میں حضرت عثمان کو قتل کر ڈالا اور حضرت علی کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ اس وقت اُمّت میں دو مختلف الخیال جماعتیں ہوگئیں جن کو سیاسی فرقے کہنا زیادہ صحیح ہے۔ مگر اس زمانے میں جاذبۂ دینی اس قدر قوی تھا کہ ہر اختلاف دینی اختلاف بن جاتا تھا۔ چنانچہ شیعۂ علی اور شیعۂ عثمان کے دو متحارب گروہ ہو گئے۔

حضرت علی کو پہلے بصرہ میں اصحاب جمل سے لڑنا پڑا۔ پھر معاویہ سے صفین کے میدان میں۔ اسی میں تحکیم کے موقع پر خود ان کے مخلص حامیوں میں سے ایک جماعت ان سے منحرف ہوگئی یعنی خوارج۔ اور ان کو اور ان کے شیعہ کو کافر کہنے لگی۔ نہروان میں ان کے ساتھ مقابلہ پیش آیا۔ ان مخالفتوں سے شیعہ خلفا ثلاثہ بلکہ سوائے چند کے جملہ صحابہ کو۔ خوارج حضرت علی اور ان کے شیعہ کو اور دونوں گروہ بنی امیہ کو کافر کہنے لگے۔ ہر فریق صرف اپنے کو حق پرست اور دوسروں کو باطل پرست سمجھتا تھا۔

اس باہمی مخالفت اور تکفیر کو اُمّت کے ارباب بصیرت اور حقیقت شناس لوگوں نے نفرت کی نظر سے دیکھا۔ وہ خلفا ثلاثہ کی تکفیر کیسے سُن سکتے تھے جن کے ایمان اور اسلامی کارنامے سورج سے بھی زیادہ روشن تھے۔ نہ صحابۂ کرام خاص کر ام المومنین حضرت عائشہ اور طلحہ و زبیر نیز امیر معاویہ کے ایمانوں میں شک کر سکتے تھے۔ نہ خوارج اور شیعہ کو جو اللہ و رسول پر ایمان رکھتے تھے اسلام سے خارج کر سکتے تھے اور نہ بنی امیہ کو جو اُمّت اسلامیہ کا علم اپنے کندھوں پر سنبھالے ہوئے تھے۔ باطل پرست کہہ سکتے تھے۔ اس لیے انھوں نے سب کو مسلمان قرار

دیا اور ان کے اعمال کے محاسبہ کو حشر کے دن پر مؤخر کر کے اللہ کے حوالہ کیا ۔ ارجاء کے معنی تاخیر کے ہیں ۔ اسی وجہ سے یہ مذہب ارجاء کے نام سے موسوم ہوا اور اس کے پیرو مرجیہ کہلائے ۔

صحابۂ کبار میں بھی بعض حضرات مثلاً عبداللہ ابن عمر ۔ سعد بن وقاص اور عمران بن حصین وغیرہ ہم کو نظر آتے ہیں جو نہ صرف ان فتنوں سے خود کنارہ کش رہے بلکہ لوگوں کو تلقین کرتے رہے کہ ان سے الگ تھلگ رہیں ۔ یہی وہ نمونہ تھا جس پر مرجیہ کی جماعت قائم ہوئی ۔

بنیادی بحث

خارجیوں نے " لاحکم الا للہ " کا نعرہ لگا کر اپنے سوا جملہ مسلمانوں کو جو حکومت کے لیے تلوار نہ اٹھائیں یا گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوں ، کافر کہا ۔ معتزلہ نے بھی مرتکب گناہ کبیرہ کو اگر کافر نہیں تو فاسق ٹھہرایا ۔ شیعہ نے امام کی معرفت اور اس کی اطاعت کو ایمان کا جزو بنا دیا ۔ اس لیے ان کے نزدیک ائمہ اہل بیت پر ایمان لائے بغیر کوئی مسلمان ہی نہیں ہو سکتا تھا مرجیہ نے ان تمام باتوں کو غلو قرار دیا ۔ انھوں نے ایمان کی بنیاد صرف " لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر رکھی اور اعمال کو اس سے خارج کر دیا ۔ ان کے نزدیک ہر وہ شخص جو کلمہ گو ہے مسلمان ہے خواہ نکوکار ہو خواہ گنہگار اعمال کا محاسبہ قیامت کے دن اللہ کے ذمہ ہے ۔ انھوں نے خارجی ۔ شیعہ اور بنی امیہ سب ہی کو مسلمان تسلیم کیا اور کسی کی تکفیر کر کے اس کو امت سے نکال دینا روا نہ رکھا ۔ یہاں تک کہ بعض مرجیہ نے اس سے بھی آگے قدم بڑھایا اور کہہ دیا کہ دل سے ایمان لانے کے بعد کوئی زبان سے خواہ یہودی ہو جائے یا عیسائی بت پرستی کرے یا صلیب پوجے اور اسی پر مر بھی جائے تب بھی اس کا حشر مسلمانوں ہی کے ساتھ ہو گا ۔

الغرض دوسرے فرقوں نے ایمان اور اسلام کے دائرہ کو جس قدر تنگ کر دیا تھا۔ مرجیہ نے اسی قدر اس کو وسیع کر دیا۔ انھوں نے امّت پر رحمت اور شفقت کی نظر ڈالی اور آپس میں لڑ لڑ کر فنا ہو جانے سے اس کو بچانے کی کوشش کی۔

مرجیہ میں بھی دو فریق تھے ایک صرف دلی تصدیق کو ایمان قرار دیتا تھا۔ دوسرا تصدیق بالجنان کے ساتھ اقرار باللسان کو بھی جزو سمجھتا تھا۔ مگر عمل بالارکان دونوں کے نزدیک ایمان سے خارج تھا۔

یہ مسئلہ بساط بحث پر آیا۔ اور معتزلہ اور خوارج نے جو اعمال کو اجزاء ایمانی شمار کرتے تھے سختی کے ساتھ مخالفت کی۔ فریقین نے اپنے اپنے دعوے پر آیات و روایات سے استدلال کیا۔ میں یہاں ان کو چھیڑوں تو اپنے موضوع سے باہر نکل جاؤں گا۔ اگر کوئی اس کو دیکھنا چاہے تو امام ابو الحسن اشعری کی مقالات الاسلامیین کا مطالعہ کرے۔

تحدید ایمان کے بعد اس سے دوسرے مسائل بھی پیدا ہوئے۔ مثلاً وہ گھٹتا بڑھتا ہے یا نہیں۔ اعمال کو خارج کر دینے کے بعد مرجیہ عام طور پر اسی کے قائل ہوئے کہ ایمان میں کمی اور زیادتی نہیں ہوتی۔

مرتکب کبیرہ کو خارجی اور معتزلی ابدی جہنمی سمجھتے تھے۔ مرجیہ نے اس سے انکار کیا وہ بڑے سے بڑے گنہگار کو بھی کافروں کی طرح مخلّد فی النار نہیں قرار دیتے بلکہ اس کی بخشش کی امید رکھتے ہیں۔

متکلمین نے اس عقیدے کی اہمیت کا پورا اندازہ کیا۔ لیکن ان کے دل میں یہ بات کھٹکتی تھی کہ اس سے اعمال شرعیہ کی حیثیت کم ہو جائے گی اور عوام جب سن پائیں گے کہ بلا عمل کے بھی نجات کی امید ہے تو اسی پر بھروسہ کر کے سستی کرنے لگیں گے۔ اگرچہ خواص کو اس سے ضرر نہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ شرعی فرائض ہیں جن کے

اور سخت محاسبہ ہوگا۔

مگر مشکل یہ تھی کہ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ اس وجہ سے سورۂ زمر کی آیت

قل یاعبادی الذین اسرفوا علی انفسہم لاتقنطوا من رحمۃ اللہ۔ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا انہ ہو الغفور الرحیم	کہہ دے کہ اے میرے بندو جنھوں نے اپنے اوپر گناہ کر کے زیادتی کی ہے۔ اللہ کی رحمت سے نا امید نہ ہو۔ وہ سارے گناہوں کو بخش دے گا۔ بے شک وہ بخشنے والا مہربان ہے۔

کا سہارا لے کر اسی راہ پر چل پڑے۔

لیکن جو اندیشہ تھا وہ صحیح نکلا۔ یعنی امّت سے ذوق عمل جاتا رہا۔ اور جب عمل نہیں تو نجات کہاں۔ سورۂ اعراف میں ہے۔

ونودوا ان تلکم الجنۃ اورثتموہا بما کنتم تعملون	اور ان سے پکار کر کہہ دیا جائے گا کہ یہ جنّت ہے جس کے تم وارث بنائے گئے ہو اپنے اعمال کے بدلے میں۔

دراصل دین کا مقصود عمل ہی ہے۔ خود ایمان بھی عمل ہے۔ اعمال قلوب میں سے۔ زیادہ قریب الفہم الفاظ میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ایمان اساس ہے۔ جس پر تعمیر عمل صالح سے ہوتی ہے۔ اگر عمارت نہ ہو تو خالی بنیاد کیا کام دے سکتی ہے۔

مگر امّت کی بے عملی کی علّت محض ارجا نہیں ہے بلکہ لامرکزیت اور مذہبی انفرادیت کو بھی اس میں دخل ہے۔ مرکز نہ ہونے کی وجہ سے اجتماعی عمل مفقود ہوا، اور جب کوئی قوت مطالبہ کرنے والی نہیں رہی تو انفرادی عمل بھی رضاکارانہ رہ گیا۔

اس مذہبی انفرادیت میں بہت سے لوگوں نے جب ظاہری مہمات ملت کو سلاطین و امرا کے ہاتھوں میں دیکھا اور اپنے اوپر ان کے دروازے بند پائے تو

باطن کی طرف رُخ کیا۔ اور درود وظیفہ اور ذکر و فکر سے اس کے تزکیہ میں مصروف ہو گئے۔ اسی راہ میں آگے بڑھ کر عجمی تصوّف سے دلچسپی ہوئی۔ جس کا اثر رفتہ رفتہ ملت کے بڑے حصہ پر چھا گیا۔ گوشہ نشینی اور عزلت گزینی نے خانقاہی ذہنیت پیدا کی جس سے عملی قوت اور بھی مسلوب ہو گئی۔ اور رضائے الٰہی اور حصول جنّت کا مدار صرف چند انفرادی اعمال پر رکھ لیا گیا۔[1]

مرجئہ اور سیاست

مرجئہ صلح پسند جماعت تھی۔ کسی مسلم کو نہ کافر قرار دیتی تھی نہ کسی پر تلوار اٹھانا جائز سمجھتی تھی۔ اس وجہ سے غیر ارادی طور پر وہ سیاست کی خدمت گزار تھی عہد صحابہ و نیز اس کے بعد کے متحارب فریقوں کے متعلق اس کا قول یہ تھا کہ دونوں میں سے کسی ایک نے اجتہاد میں غلطی کھائی جس کی تنقیح ہمارے ذمہ نہیں ہے۔ ہر فریق اپنے وجوہ رکھتا تھا جن کو وہ اللہ کے سامنے پیش کرے گا۔ وہاں فیصلہ ہوگا۔

خلفاء بنی امیہ کو مومن اور ان کے ساتھ تعاون کو صحیح سمجھتے تھے یہی وجہ تھی کہ ان کی طرف سے کبھی کوئی گرفت نہیں ہوئی۔ عباسیہ کے ساتھ بھی ان کا رویہ یہی رہا۔ مامون الرشید کہا کرتا تھا کہ "الارجاء دین الملوک" یعنی ارجاء بادشاہوں کا مذہب ہے۔ غالباً اس کا مقصد یہ تھا کہ بادشاہوں کو ایسا صلح کل مذہب پسند ہے اس لیے یہ جماعت پھیلی۔ مجھے ان مورخوں کے بیان پر تعجب ہے جو کہتے ہیں کہ

---

[1] تصوف کے عناصر تمام تر بیرونی ہیں مختلف اقوام میں یہ اسلام سے پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے اس کی ریاضتوں سے جو صوفیانہ قوتیں پیدا ہوتی ہیں وہ تمام تر تخیلی ہیں۔ یہ دین نہیں ہے بلکہ فن ہے جس کو ہر مسلم اور غیر مسلم انھیں ریاضتوں سے حاصل کر سکتا ہے۔

مرجیہ بالآخر ختم ہو گئے۔ حالانکہ وہ ختم نہیں ہوئے بلکہ جملہ اہل سنت نے ان کے اکثر عقائد قبول کر لیے۔ اس لیے یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ اُمّت نے ان کو اپنے اندر جذب کر لیا اور اس نام سے کوئی مخصوص فرقہ باقی نہیں رہا۔

امام ابو حنیفہ

امام ابو الحسن اشعری نیز شیخ عبد القادر جیلانی وغیرہ متعدد بزرگوں نے لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب مرجیہ تھے لیکن اس الزام سے امام موصوف اور ان کے اصحاب کو ضرر کیا ہے۔ وہ یہی تو کہتے تھے "لانکفر اہل القبلہ" یعنی ہم کسی قبلہ رخ ہونے والے مسلمان کو کافر نہیں کہتے۔ علماء اہل سنت میں سے کون صاحب بصیرت ایسا ہے جو اس سے انکار کر سکے۔ ہاں ایمان کے نہ گھٹنے اور بڑھنے کا مسئلہ جو مذہب ارجاء نے پیدا کیا تھا اس کی نسبت جو ائمہ حنفیہ کی طرف کی جاتی ہے وہ مزید ثبوت کی محتاج ہے۔ کم سے کم امام اعظم کے متعلق میں اس قول کو صحیح نہیں سمجھتا۔ کیونکہ آیات میں جا بجا ایمان کی کمی اور زیادتی کا ذکر ہے اور امام ابو حنیفہ سے بڑھ کر کون قرآن کا راز داں ہو گا۔

علوم اسلامیہ

میں یہ پہلے لکھ چکا ہوں کہ خلفاء راشدین میں امت کی سیاسی مرکزیت بھی تھی اور دینی مرکزیت بھی۔ ہر قسم کے اجتماعی مقاصد کی تشکیل وہی کرتے تھے۔ اور جملہ دینی مہمات انھیں کے یہاں طے کیے جاتے تھے۔ اس وجہ سے امت میں نہ سیاسی تفریق تھی نہ مذہبی لیکن ان کے بعد خلفاء بنی امیہ نے ملک، فوج اور خزانہ پر قبضہ کر کے سیاست کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں رکھی اور دینی قیادت چھوڑ دی جو علماء کے ہاتھوں میں آگئی۔ ہر مقام کے اہل علم وہاں کے لوگوں کی رہنمائی کرنے لگے۔ ان میں اختلافات واقع ہونے شروع ہوئے۔ جن کے فیصلے کے لیے کوئی مرکز نہ تھا۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مرکز بنائی گئی اور ہر مسئلہ اور ہر اجتہاد کی تائید کے لیے روایت کا سلسلہ نکالا گیا۔

بنی امیہ کے زمانے میں قرب عہد صحابہ اور سادہ زندگی ہونے کے باعث اختلافات بھی کم تھے اور روایتیں بھی کم تھیں۔ لیکن عہد عباسی میں جب علوم دخیلہ عربی میں منتقل ہوئے عجمی اقوام سے اختلاط ہوا اور مختلف اہل مذاہب سے واسطہ پڑا اُس وقت بہت سے جدید مسائل اور معاملات سامنے آئے اور روایات نے بڑھتے بڑھتے ایک باقاعدہ فن کی صورت اختیار کر لی۔ اور سینکڑوں بلکہ ہزاروں آدمیوں نے یہی پیشہ اختیار کر لیا۔ چونکہ روایت کے لیے کسی قابلیت یا معیار علم کی شرط نہیں تھی اس وجہ سے ہر شخص جس میں ذرا بھی دین داری ہوتی اس میں حصہ لے کر دینی بزرگی اور دنیاوی عزت حاصل کرتا۔

قرآن کو خلفاء بنی امیہ (بجز حضرت عمر بن عبد العزیز) اور خلفاء بنی عباس نے جو

دراصل مستبد سلاطین تھے اپنی مخصوص سیاست سے متروک کر رکھا تھا۔ اب ان راویوں نے دینی حیثیت سے بھی اس کو روایتوں کے اندر دفن کر دیا۔ اس کی تشریح وتفسیر بھی ان ہی سے کرنے لگے اور حدیث کا تسلّط یہاں تک بڑھ گیا کہ امام اوزاعی متوفی ۱۵۷ھ نے کہا کہ قرآن اس سے زیادہ حدثیوں کا محتاج ہے جس قدر حدثیں قرآن کی اور امام یحییٰ بن کثیر نے کہا کہ حدیث قرآن پر قاضی ہے۔ قرآن حدیث پر قاضی نہیں ہے۔ روایتوں سے قرآن کے عام کو خاص۔ خاص کو عام۔ مقید کو مطلق اور مطلق کو مقید بلکہ اس پر اضافے بھی کرنے لگے۔ نیز بعض ائمہ فقہ نے روایات سے آیات کو اصولاً منسوخ کرنے کا فتویٰ دے دیا۔ اس طرح پر قرآن کے استقلال کو مٹا کر اس کو حدثیوں کا ماتحت بنا دیا جس کی بدولت دین خالص قرآنی نہیں رہا بلکہ روایاتی ہو گیا اور اس میں سینکڑوں باتیں ایسی داخل ہو گئیں جن کا نام و نشان بھی قرآن میں نہیں ہے۔

روایات کے اختلافات کے باعث امّت میں دینی لحاظ سے انتشار ہوا جو برابر بڑھتا گیا۔ علوم اسلامیہ جس سے میری مراد تفسیر۔ حدیث اور فقہ ہیں اس کا مظہر بن گئے مختلف قسم کی جماعتیں پیدا ہو گئیں جو اپنے خیالات و عقائد کے ماتحت نئے نئے اسلوب سے آیات کی تاویلیں کرنے لگیں اور روایات میں بھی وضع اور کذب سے کام لینے لگیں۔ ان کے علاوہ سیاسی فرقے آیتوں کی تشریح اور حدثیوں کی روایت اپنے مقاصد اور اغراض کے مطابق کرتے تھے اور ان کے اوپر کوئی احتساب نہ تھا۔ اس وجہ سے حدیث کا بڑا حصہ نہ صرف غلط بلکہ امّت کے لیے مضر ہو گیا۔

انھیں روایات سے قرآن کی تفسیریں کی گئیں جو جانچنے کے بعد عام طور پر ضعیف بلکہ موضوع نکلیں۔ پھر انھیں دونوں سے فقہ مرتب ہوئی جو اختلاف روایات و تاویلات کے باعث ایک نہیں بلکہ کئی ایک ہو گئی۔

ان علوم میں سے تفسیر و حدیث کے متعلق میں الگ الگ مبسوط مقالے لکھ چکا ہوں

جو ادارہ طلوع اسلام دہلی سے شائع ہو چکے ہیں۔ اس لیے ان کو یہاں دُہرانا پسند نہیں کرتا۔ ہاں فقہ کے بارے میں اب تک کچھ نہیں لکھا ہے۔ لہٰذا اس پر ایک سرسری تنقیدی نگاہ ڈالنا یہاں ضروری سمجھتا ہوں۔

فقہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کے بعد تیرہ سال مکہ مکرمہ میں گزارے پھر ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں تشریف لے گئے اور دس سال وہاں رہے۔ مکہ میں جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں توحید کی دعوت، مکارم اخلاق کی تعلیم، شرک و کفر کی تردید وغیرہ کی آیتیں نازل ہوتی رہیں۔ شرعی مسائل نہیں تلقین کیے گئے۔ بعض امور مثلاً نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کے احکام بھی اُترے تو ان کی اس قدر تفصیل نہیں کی گئی جس قدر مدینے میں آکر ہوئی۔ وجہ ظاہر ہے کہ قوانین کی احتیاج اس وقت ہوتی ہے جب جماعت بن جائے۔ مدینے میں آکر مسلمانوں کی اجتماعی زندگی شروع ہوئی۔ اس لیے ضوابط کی ضرورت پڑی جن کی اصولی تعلیم قرآن میں دی گئی۔

یہ قانونی یا فقہا کی زبان میں احکامی آیتیں زیادہ نہیں ہیں۔ قرآن کی کم و بیش چھ ہزار آیتوں میں سے صرف دو سو آیتیں تشریعی ہیں۔ بعض لوگوں نے یہ تعداد بڑھا کر پانسو تک پہنچا دی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے بہت سی آیات کو احکامی قرار دینے میں غلو سے کام لیا ہے۔

اکثر یہ آیتیں ضرورت پیش آنے پر اُترتی تھیں۔ رسول اللہ ان کی رو سے احکام دیتے یا فیصلے کرتے تھے۔ بعض آیات میں جزوی احکام بھی ہیں مگر زیادہ تر ایسی ہیں جو اصول کا حکم رکھتی ہیں جن کی تفصیل یا تشکیل آنحضرتؐ اپنے قول یا عمل سے کرتے تھے مثلاً نماز کا حکم قرآن میں ہے لیکن اس کی عملی شکل رکعتوں کی تعداد اور اوقات کی

تعیین وغیرہ رسول اللہ نے فرمائی۔ اسی طرح زکوٰۃ کا حکم مطلق ہے۔ یہ اس کا نصاب۔ اس کی مقدار اور ادائگی کی مدت حضور نے معین کی۔ یہی صورت روزہ۔ حج۔ نکاح۔ طلاق وغیرہ کے احکام کی ہے۔ اس طرح پر امت کے پاس شریعت کے لیے دو چیزیں ہوگئیں احکامی آیات اور رسول اللہ ؐ کی استنباطات۔ جن کو فقہ کی اصطلاح میں کتاب وسنّت کہتے ہیں[1]۔

ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہر قسم کی ضروریات نہ پیش آسکتی تھیں نہ ان کے لیے احکام دیے جا سکتے تھے۔ اس لیے کتاب وسنت کو اصل قرار دے کر آئندہ کے لیے اجتہاد کا دروازہ کھول دیا گیا کہ اگر ان دونوں میں کسی پیش آنے والی ضرورت کے بارے میں حکم نہ ملے تو خلیفہ یا امیر کو اہل علم کے مشورے سے غور وفکر کے بعد نظائر پر قیاس کر کے اپنی عقل سے حکم نکالنا چاہئے۔ اس لیے تشریع میں تیسری چیز قیاس یا رائے ہوئی۔ اجماع اکثریت کے اتفاق آرا کا نام ہے۔ وہ رائے سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔

فقہ صحابہ

رائے کا استعمال نہ صرف ضرورتاً بلکہ عقلاً ناگزیر ہے۔ کیونکہ قرآن کا خطاب انسانی عقل ہی سے ہے۔ چنانچہ آنحضرت ؐ کے بعد ہی صحابۂ کرام کے سامنے خلافت کا اہم مسئلہ پیش آیا جس کے بارے میں نہ کوئی تصریح کتاب میں تھی نہ سنّت میں۔

---

[1] یہاں سنّت سے آنحضرت ؐ کا ہر قول وفعل مراد نہیں ہے بلکہ وہ اقوال واعمال ہیں جن کی اصولی تعلیم قرآن میں ہے اور ان کی تفصیل بالشکیل حضور نے فرمائی ہے۔ یہ سنت امت میں عمل متواتر کی شکل میں موجود ہے جو یقینی اور دینی ہے اور ان کے متعلق جو روایات ہیں وہ تمام تر ظنی ہیں ان کی قبولیت قرآن یا عمل متواتر کے موافق ہونے کی وجہ سے ہوگی۔

اس وقت انھوں نے رائے سے کام لیا اور معاملے کو اپنی عقل سے سلجھایا۔ سقیفہ بنی ساعدہ ان کے استعمال رائے کا سب سے پہلا مظہر تھا۔ اس کے بعد مرتدین عرب سے جہاد کا فیصلہ بھی رائے ہی سے کیا۔ پھر مہاجرین و انصار کے وظائف کا معاملہ پیش ہوا۔ اس میں بھی اختلاف رائے ہوا۔ صدیق اکبر مساوات چاہتے تھے۔ حضرت عمر کہتے تھے کہ جن لوگوں نے نبی اور اسلام کی خاطر گھر بار چھوڑا ان کو زیادہ ملنا چاہیئے۔ انھوں نے فرمایا کہ ان کا عمل اللہ کے لیے تھا جس کا اجر آخرت میں ملے گا دنیاوی گزارے میں امتیاز قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ چنانچہ انھوں نے سب کا وظیفہ مساوی رکھا۔ حضرت عمر نے اپنے عہد میں طبقات کے لحاظ سے تقسیم کی۔ پھر حضرت علی نے خلیفہ ہونے کے بعد اس تفریق کو مٹا دیا۔

خلفاء راشدین میں سے حضرت عمر کے تفقہ میں رائے کا استعمال بہت نمایاں ہے وہ غیر مصرح احکام کے استنباط میں علماء صحابہ سے مشورے بھی لیتے اور بحثیں بھی کرتے تھے۔ صوبوں سے جو سوالات آتے ان میں بھی لوگوں سے استفسار کرتے۔ اور بعض کا جواب مہینوں کی بحث و تمحیص کے بعد دیتے۔

یمن کے والی نے ایک مقتول کے مقدمے میں جس کو دو شخصوں نے مل کر قتل کیا تھا ان کو لکھا کہ دونوں سے قصاص لیا جائے یا صرف ایک سے؟ وہ جواب میں متردد تھے حضرت علی نے کہا کہ فرض کیجیے چند آدمیوں نے مل کر ایک اونٹ چرایا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کاٹ کر بانٹ لیے۔ کیا آپ ان سب کے ہاتھ نہیں کاٹیں گے؟ حضرت عمر نے فرمایا کہ کیوں نہیں۔ بولے کہ بس یہی صورت یہاں ہے دونوں قتل میں شریک ہیں دونوں قصاص کے سزاوار۔ اب انھوں نے والی کو لکھا کہ دونوں کو قتل کردو بلکہ اگر صنعاء کے کل باشندے اس قتل میں شریک ہوتے تو میں سب سے قصاص لینے کا حکم دیتا۔

اسی طرح شراب خوری کی سزا جو نہ کتاب میں ہے نہ سنت میں جب متعین کرنی چاہی تو حضرت علی نے رائے دی کہ اس پر مفتری کی حد جو قرآن میں ۸۰ کوڑے ہے قائم کرنی چاہیئے کیونکہ مدہوش ہذیان ہے اور ہذیان میں افترا بھی ہوتا ہے۔ حضرت عمر نے اس توجیہ کو پسند کیا اور یہی حد مقرر کر دی۔

وہ تفقہ میں علّت حکم کی مصلحت کو بنیادی شے قرار دیتے تھے اور تفریع میں اسی کا لحاظ رکھتے تھے۔ قرآن نے صدقات میں سے ایک حصہ مؤلفۃ القلوب کا بھی رکھا ہے اب یہ دیکھنا کہ تالیف قلب کا صیغہ کہاں اور کب تک مناسب ہے مرکز کے اختیار تمیزی پر ہے۔ رسول اللہ نے اقرع بن حابس اور عیینہ بن حصن کو جو امرا قبائل تھے ایک بار تالیف قلب کے لیے سو سو اونٹ دیے تھے۔ پھر خلیفہ اول کے عہد میں بھی ان دونوں نے آکر کچھ زمینیں طلب کیں۔ اُنھوں نے ان کے نام لکھ دیں۔ حضرت عمر نے اپنے زمانہ میں ان اراضی کو واپس لے لیا۔ اور فرمایا کہ اللہ نے اسلام کو قوت دے کر اب تمھاری مدد سے اس کو بے نیاز کر دیا ہے۔ وہ زمین ان کے حقداروں کو دی جائے گی اور تم نہ مانو گے تو تلوار سے فیصلہ ہوگا۔

اسی طرح قرآن نے حکم دیا ہے کہ چور کے ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں لیکن چور کا اطلاق کس کے اوپر ہوتا ہے اس کی تعیین قانون ساز جماعت پر چھوڑ دی ہے۔ چنانچہ حضرت عمر نے قحط سالی میں ان لوگوں کو جو بھوک سے مجبور ہو کر کھانے کے لیے کوئی چیز چرا لیتے تھے۔ قطع ید کی سزا نہیں دی کیونکہ ان کی رائے میں وہ چور نہیں تھے۔ ایک بار حضرت حاطب بن ابی بلتعہ کے غلاموں نے مزینہ کے ایک شخص کا اونٹ چرا کر کھا لیا۔ جب حضرت عمر کے سامنے پیش کیے گئے تو اعتراف کیا۔ مگر علت وہی بھوک تھی۔ اس لیے ان کے ہاتھ نہیں کاٹے بلکہ حاطب کے بیٹے عبدالرحمٰن کو بلا کر کہا کہ مجھے معلوم ہوا کہ تم لوگ ان غلاموں سے کام لیتے ہو اور کھانے کو نہیں دیتے ہو۔

اگر یہ شکایت آئندہ میرے پاس آئی تو میں تم کو ایسی سزا دوں گا کہ یاد رکھو گے۔

رائے کی اہمیت

یہ مثالیں میں نے اس لیے بیان کیں کہ معلوم ہو جائے کہ خلفاء راشدین رائے کا استعمال کہاں اور کس طرح کرتے تھے۔ اور ان کے نزدیک اس کی کس قدر اہمیت تھی۔ وہ خود سوچتے۔ دوسروں سے مشورے لیتے اور بحثیں بھی کرتے تھے۔ چونکہ ہمارے عقیدے میں یہ حضرات معصوم نہ تھے۔ اس وجہ سے بعض بعض مسائل میں ہم کو ان کی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں۔ مثلاً حضرت عمر نے وراثت میں عول کا قاعدہ جاری کیا جب ان کے سامنے فرائض کے ایسے مسائل پیش ہوئے جن میں مخرج ورثہ کے سہام معینہ سے کم تھا تو انھوں نے حضرت زید بن ثابت سے جو صحابہ میں فن وراثت کے سب سے بڑے ماہر تھے مشورہ کیا۔ بالآخر اس کے سوا چارہ نظر نہ آیا کہ مخرج کو بڑھا کر کمی جملہ ورثہ پر ڈال دی جائے۔ اسی کو عول کہتے ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے۔

زینب ۔ مسلہ ۶ ۔ عول ۱۰

شوہر ۳ ماں ۱ دو حقیقی بہنیں ۴ دو اخیافی بہنیں ۲ ۔ فقہا کے نزدیک اس صورت میں قرآن کی رو سے شوہر کا حصہ نصف ہے۔ ماں کا سدس۔ دو حقیقی بہنوں کا دو ثلث اور اخیافی بہنوں کا ایک ثلث۔ اس لیے مسلہ ۶ سے ہوا۔ لیکن جب اس کو حصہ داروں میں تقسیم کیا تو مجموعہ ۱۰ ہو گیا۔ اب ہر ایک وارث کو ۶ میں سے جس قدر ملنا چاہیے تھا دس میں سے ملا۔ اس طرح کمی تو بقدر رسدی سب کے حصہ میں آگئی مگر ہو گئی قرآن کی مخالفت۔

حضرت عبداللہ بن عباس نے یہ سوچ کر کہ کیا قرآن کا اتارنے والا پروردگار (نعوذ باللہ) حساب سے ناواقف ہے۔ آیات وراثت میں زیادہ غور کیا تو اصل حقیقت ان کے اوپر ظاہر ہو گئی کہ دو مختلف تقسیمیں ہیں جن کو ایک کر دینے سے یہ خرابی پیدا ہوئی

ہے۔ ورنہ عول قرآن کے بالکل خلاف ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس پر مباہلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ زفر بن حارث نے ان سے کہا کہ جب یہ مسئلہ آپ کی سمجھ میں آ گیا تھا تو آپ نے حضرت عمر کو سمجھانے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ بولے کہ ان کے رعب سے میں کچھ نہ کہہ سکا۔

کاش انھوں نے سمجھایا ہوتا۔ ممکن تھا کہ حضرت عمر مان جاتے۔ پھر نہ فقہ کے ائمہ اربعہ اس کو اختیار کرتے نہ آج تک یہ امت میں چلا آتا۔ اسی طرح جد کی توریث میں بھی وہ کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے۔ بلکہ حافظ ابن حجر کے بیان کے مطابق زندگی بھر اس میں مختلف فیصلے کرتے رہے۔ بعض روایات سے جو میرے نزدیک مشتبہ ہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر نے تین طلاقوں کو جو بیک وقت دی جائیں طلاق بائنہ قرار دیا۔ یہ بھی قرآن کے خلاف ہے۔

لیکن یہ غلطیاں اجتہادی ہیں جن سے کوئی مجتہد بچ نہیں سکتا۔ بیشک بعد والوں کا فریضہ تھا کہ تصحیح کرتے۔ مگر انھوں نے تنقیدی نظر ڈالنے کی ہمت نہیں کی۔ حالانکہ قرآن کا ایک حرف بھی اپنی جگہ قائم کرنا سب سے بڑی دماغی نعمت اور حق کی عبادت ہے۔

اجتہاد اور تفریع مسائل میں صحابۂ کرام میں حضرت علی۔ زید بن ثابت۔ ابو موسیٰ اشعری ابی بن کعب اور معاذ بن جبل وغیرہ خصوصیت کے ساتھ ممتاز تھے۔ عہد فاروقی میں فتوحات کا دائرہ وسیع ہو جانے کی وجہ سے سینکڑوں قسم کے جدید مہمات مسائل پیش آئے جن میں یہ حضرات خلیفہ کے اجتہاد میں مدد دیتے تھے۔ یہ طرز عمل صالح تخم تھا جس سے آئندہ قانون ساز جماعت بن جاتی اگر استبداد نہ مسلّط ہو جاتا۔

حضرت عمر نہ صرف شرعی بلکہ اقتصادی اور عمرانی امور میں بھی رائے سے کام لیتے

لہ اس مسئلہ کو دلیل اور تفصیل کے ساتھ ہم نے اپنی عربی کتاب الوراثۃ فی الاسلام میں لکھ دیا ہے جو مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہو چکی ہے۔

تھے۔ انھیں کے شیدائی اور شاگرد خاص حضرت عبداللہ بن مسعود تھے جو عراق کے دینی معلم تھے۔ یہی وجہ ہوئی کہ وہاں کے فقہا جن کی امامت ابو حنیفہ پر منتہی ہوئی اصحاب رائے کہے گئے۔ ابو حنیفہ حمّاد کے شاگرد تھے اور حماد ابراہیم نخعی کے۔ نخعی نے علقمہ سے اخذ کیا جو ابن مسعود کے تلمیذ خاص تھے۔

مذاہب اربعہ

فقہ میں اہل سنت کے گو چار مذاہب مشہور ہیں حنفی۔ شافعی۔ مالکی اور حنبلی لیکن علمی لحاظ سے نظر ڈالی جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ صرف دو ہی مذاہب ہیں۔ اصحاب رائے و اصحاب حدیث۔ جہاں تک میری سمجھ میں آسکا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد جب دینی لامرکزیت پیدا ہوگئی اس وقت مدینہ میں محتاط صحابہ کی ایک جماعت صرف حدیثوں پر عمل کرنے لگی۔ اکثر تابعین بھی اسی خیال کے ہوئے ان کو جس مسئلہ میں کوئی آیت یا روایت نہ ملتی خاموش رہتے اور رائے کو مکروہ سمجھتے سالم بن عبداللہ بن عمر سے کسی نے ایک مسئلہ پوچھا۔ فرمایا کہ اس بارے میں مجھے کوئی حدیث نہیں پہنچی ہے۔ اس نے کہا اپنی رائے سے جواب دیدیجیے بولے کہ ممکن ہے کل وہ رائے بدل جائے پھر میں تم کو کہاں ڈھونڈھتا پھروں گا۔

اسی طرح امام احمد بن حنبل سے ان کے بیٹے عبداللہ نے دریافت کیا کہ اگر کوئی شخص کسی جگہ ہو جہاں اصحاب رائے ہوں لیکن ایسا محدث نہ ہو جو رطب و یابس میں تمیز کر سکتا ہو تو کیا کرے۔ بولے کہ محدث ہی سے پوچھے اور اصحاب رائے کے پاس نہ جائے ضعیف حدیث بھی رائے سے بہتر ہے۔

اس طرح یہ لوگ رائے سے تو بچے رہے لیکن ضرورتوں کو کیسے رد کرتے۔ اس کا بلا ارادہ نتیجہ یہ ہوا کہ حدیثیں بنائی گئیں اور اس کثرت سے کہ پھر رائے کی حاجت کم رہ گئی۔ مدینہ کے امام۔ مالک بن انس تھے۔ ان کے شاگرد تھے شافعی اور شافعی

سے احمد بن حنبل نے اخذ کیا۔ اسی طرح یہ تینوں مذاہب تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ امام مالک اور شافعی بھی رائے اور قیاس کو استعمال کرتے تھے لیکن واقعات میں، مفروضات میں نہیں اور نہایت احتیاط کے ساتھ بشرطیکہ مبنیٰ کوئی مستند روایت ہو۔ اور حنبلی مذہب کی بنیاد تو تمام تر حدیث ہی پر ہے غالباً یہی وجہ ہوئی کہ امام اوزاعی اور داؤد ظاہری کے مذاہب جو اس سے قریب تر تھے اسی میں جذب ہو کر رہ گئے۔

عراقی مذہب کے بھی ایک بڑے رکن امام محمد نے امام مالک کی شاگردی کی تھی۔ لیکن یہاں تفریع مسائل کے جو اصول ابراہیم نخعی کے زمانے سے بن چکے تھے۔ ان کے مطابق رائے کا استعمال برابر جاری رہا۔ اس وجہ سے فقہا کے دو نمایاں گروہ ہو گئے اصحاب حدیث و اصحاب رائے۔ جن میں باہم اختلافات بھی تھے اور مخالفت بھی۔

عراقی فقہ

عراقی فقیہوں کی جماعت اپنے قاعدوں کے مطابق قیاس کو آزادی کے ساتھ استعمال کرتی تھی۔ یہی وجہ ہوئی کہ ان میں اختلافات کی بہت کثرت ہو گئی۔ حجازی فقیہوں میں بھی اختلافات ہیں مگر کم۔ بلکہ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی میں بھی اس قدر اختلافات نہ ہوں گے جس قدر کہ خود فقہاء عراق میں ہیں۔ جس کے وجوہ یہ ہیں:۔

(۱) قیاسات کا مدار فکر پر ہے اور سب کا طریق فکر نہ ایک تھا نہ ایک ہو سکتا تھا۔ چنانچہ خود صاحبین یعنی امام ابویوسف اور امام محمد میں جو ایک ہی استاد کے شاگرد اور ایک ہی طریق فکر و اصول کے پیرو ہیں بے شمار اختلافات ہیں۔

(۲) یہ لوگ مفروضات میں گھس جاتے تھے۔ یعنی ہر ایک مسئلہ کی جتنی خیالی شکلیں ہو سکتی تھیں سب کو معرض بحث میں لاتے تھے۔ جن کے جوابات مختلف ہوتے تھے۔ ایک مسئلہ کا حکم نکالتے پھر استاد سے "ارایت لوکان کذا" (دیکھیے تو اگر صورت یہ ہو)

کہہ کر اس صورت کو حل کرتے۔ اصحاب حدیث اس کو سخت ناپسند کرتے تھے امام شعبی نے کہا کہ ان لوگوں سے مجھے اتنی نفرت ہے کہ مسجد میں آتے ہوئے کوفت ہوتی ہے کسی نے پوچھا کن لوگوں سے ؟ بولے ان آرائیتوں "سے۔
امام مالک کی محفل بہت با وقار تھی۔ ان سے کسی کو سوال کرنے کی جرأت مشکل سے ہوتی تھی۔ اسد بن الفرات نے ایک بار کوئی سوال کیا۔ امام موصوف نے اس کا جواب دیا۔ پھر انھوں نے پوچھا کہ اگر شکل یہ ہو۔ بولے کہ یہ سلسلہ بنت سلسلہ ہے۔ اگر اس کے خواہش مند ہو تو عراق چلے جاؤ۔

اس زمانے میں حدیث کا غلبہ اس قدر تھا کہ بلا روایتی ستار کے کسی کے قول۔ استنباط یا اجتہاد کی کوئی قیمت نہیں سمجھی جاتی تھی۔ غالباً یہی وجہ ہوئی کہ عراقی فقہا بھی مسائل میں اپنی رایوں کی تائید کے لیے حدیثیں پیش کرنے پر مجبور ہوئے۔ مگر ان کی بہت سی روایتیں ایسی ہیں جن کی زبان تک بھی محدثانہ نہیں بلکہ فقیہانہ ہے۔
امام ابو حنیفہ کے شاگرد رشید امام ابو یوسف بغداد کے قاضی القضاۃ ہو گئے تھے۔ انھوں نے اپنی قابلیت سے فقہ حنفی کو دولت عباسیہ کا رسمی قانون بنا دیا۔ جس کے باعث اس میں بہت وسعت پیدا ہو گئی اور مدت دراز تک مشرقی ممالک میں اسلامی مدنیت کا ساتھ دیتی رہی۔ علامہ ابن خلدون نے افریقہ اور اندلس میں مالکی مذہب کے پھیلنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ چونکہ ان ممالک میں بداوت تھی اور ان کے باشندے اس تہذیب سے جو عراق میں تھی ناآشنا تھے، اس وجہ سے مالکی مذہب جو سادہ اور ان کی طبائع کے مناسب حال تھا ان میں مقبول ہوا۔
اس قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ امام جس شہر کا ہوتا ہے اس کی بداوت یا حضارت کا اثر نہ صرف اس کی فقہ بلکہ اس کی رائے کی تکوین پر بھی پڑتا ہے حالاں کہ فقہ کی بنیاد کتاب و سنت پر ہے جو مقامی اثر سے بالاتر ہے۔

بے شک حنفی فقہ میں بعض مسائل میں وسعت اور رخصت نظر آتی ہے۔ مثلاً وہ نماز کو فارسی میں بھی پڑھنے کی اجازت دیتی ہے اور قرآن کی تلاوت کو دوسری زبانوں میں بھی مباح کرتی ہے۔ اسی طرح عاقل بالغ عورت کو بلا ولی کے نکاح کا اختیار دیتی ہے۔ اور امام مالک اور شافعی ان امور کو روا نہیں رکھتے۔ مگر اسی کے ساتھ اس میں کہیں کہیں تنگی اور سختی بھی ہے۔ مثلاً اس میں نکاح کے معاملے میں کفارت کا اعتبار کیا گیا ہے کہ قریش فلاں قبیلہ کے کفو ہیں اور عجمی نومسلم عرب کے کفو نہیں ہیں۔ اس کفارت نے اسلامی برادری کی وسعت کو مٹا دیا اور اس کی اشاعت میں رکاوٹ کا موجب ہوئی بہت سے گھرانے آسانی سے اسلام لانے کے لیے آمادہ ہو سکتے ہیں اگر ان کو یقین ہو جائے کہ ان کی بیٹیاں اچھے گھروں میں جا سکیں گی۔ بخلاف اس کے مدنی فقہ میں سارے کلمہ گو ہم کفو تسلیم کیے گئے ہیں اسی طرح حنفی فقہ نے عورتوں کے حق خلع کو ضبط کر لیا جس کے نتائج ہند میں ہمارے سامنے ہیں کہ مسلمان بیویاں اپنے شوہروں کے مظالم سے تنگ آکر جب رہائی کی کوئی صورت نہیں دیکھتی ہیں تو مذہب تبدیل کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

اس لیے علامہ موصوف کی یہ رائے فقہوں کے تقابلی مطالعہ پر نہیں بلکہ محض قیاس پر مبنی ہے۔ بے شک امام ابو حنیفہ کے اقوال عام طور پر قرآن کے مطابق ہیں حنفی فقہ سے ان کو نکال لینے کے بعد اس کا بقیہ حصہ سب فقہوں سے زیادہ ترمیم کے قابل ہے۔

متاخرین فقہاء حنفیہ نے تو خیالی تفریعوں اور قانونی موشگافیوں میں اس قدر غلو کیا ہے کہ ابواب نکاح و طلاق میں ان کی لفظی بحثیں عقل و علم کی حد سے آگے بڑھ گئی ہیں اور کتاب الحیل جس میں نہ صرف ضمیر کو دھوکا دینے بلکہ شرعی قوانین کو بیکار کرنے کی کوشش کی گئی ہے تقوے کے خلاف ہے۔[1]

---

[1] اس کی تفصیل دیکھنی ہو تو علامہ ابن القیم کی کتاب اعلام الموقعین مطالعہ کیجیے جو دو ضخیم جلدوں میں اسی عنوان پر ہے۔

تقلید

ہر صاحب نظر اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ قانون سازی کا حق صرف مرکزی جماعت کو ہے۔ اسی کا بنایا ہوا قانون پوری امت کا قانون ہوتا ہے۔ لیکن خلافت راشدہ کے بعد جب امت کی دینی مرکزیت جاتی رہی تو اس مذہبی انفرادیت میں علماء نے شخصی فقہیں مرتب کیں۔ انھوں نے جو کچھ کیا خلوص اور تقویٰ کے ساتھ کیا۔ ان کی شخصیتیں اس قدر محترم تھیں کہ خلفاء کو جب تک کہ ان کی سیاست پر زد نہ پڑتی ہو کبھی ان کے مسائل میں دخل دینے کی جرأت نہ ہوئی۔ امام مالک کو جو مجبور کی طلاق کو ناجائز کہتے تھے عباسی خلیفہ نے کوڑوں سے پٹوایا تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ یہ مسئلہ غلط تھا بلکہ اس سے مجبور کی بیعت خلافت ناجائز قرار پاتی تھی۔

ان فقہاء کرام کا مقصد ہرگز یہ نہ تھا کہ ان کی بنائی ہوئی فقہوں کو لوگ الگ الگ مذہب بنالیں۔ اس لیے ان کے بعد کے علماء کا فریضہ تھا کہ ان میں سے ہر ایک کو اپنا پیشوا مان کر ان کے اجتہادوں میں امتزاج پیدا کرتے اور سب کی فقہوں کو ملا کر ایک فقہ بنا لیتے لیکن ایسا نہ ہوا بلکہ ہر فقہ کے پیروؤں نے رفتہ رفتہ اسی کو اپنا مذہب بنا لیا اور دوسرے ائمہ کی فقہوں کو چھوڑ دیا۔ اس تقلید کا نتیجہ یہ ہوا کہ امت میں تفریق اور نزاع بڑھتی گئی بالآخر یہ طے کیا گیا کہ چاروں مذاہب حق ہیں۔ مگر اس کا مفہوم یہ رکھا گیا کہ حنفی مذہب حنفیوں کے لیے اور شافعی مذہب شافعیوں کے لیے حق ہے۔ ایک کو دوسرے کی فقہ کے مطابق فتویٰ دینا روا نہیں۔ اس سے نزاع تو کم ہو گئی مگر تفریق بدستور باقی رہی جو آج تک قائم ہے۔ ہر ہر فرقہ کے امام الگ ہیں۔ علماء الگ ہیں، کتابیں الگ ہیں گویا ہر فقہ ایک مستقل مذہب ہے اور ہر ایک کے پیرو ایک مستقل امت۔ یہاں تک خانہ کعبہ میں چار مصلّے بھی الگ الگ تعمیر کیے گئے جو امت کے مذہبی تفریق کے مظاہر ہیں۔ اور جن کو دیکھ کر ہر صاحب بصیرت اور درد مند مسلمان کو قلق ہوتا ہے۔

شیعی فقہ

شیعی حدیث و فقہ کا بڑا مرجع امام جعفر صادق کی ذات ہے۔ بلکہ انھیں کی نسبت سے یہ مذہب جعفری کہا جاتا ہے۔ وہ نہ اجماع کو صحیح سمجھتے تھے نہ قیاس کو۔ اس لیے اس فقہ کا تمامتر دارومدار کتاب وسنت پر ہے۔ چونکہ شیعوں کی حدیث اپنے ائمہ کے متعلق مخصوص عقائد رکھنے کی وجہ سے سنیوں سے مختلف ہے اس وجہ سے ان کی فقہ بھی الگ ہوگئی۔

یوں تو فریقین کے اختلافی مسائل بہت ہیں جن کا شمار مشکل ہے۔ لیکن تین مسئلوں میں اہل سنت سے الگ ہو کر شیعوں نے اپنے فرقہ کا امتیاز قائم کیا ہے۔

(۱) وضو میں پاؤں کو دھونے کے بجائے ان پر مسح کرتے ہیں۔

(۲) اذان میں حیّ علی الفلاح کے بعد حی علی خیر العمل پکارتے ہیں۔

(۳) متعہ کو جائز سمجھتے ہیں جو سنیوں کے ہاں شروع سے بالاتفاق حرام ہے۔

متعہ یہ ہے کہ ایک معین مہر پر معین مدت کے لیے نکاح کیا جائے۔ اس میں نہ تعداد کی حد ہے نہ گواہ کی ضرورت۔ نہ وراثت ہے نہ طلاق۔ مدت گزر جانے پر نکاح خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔

شیعہ نے بھی کوشش کی کہ خانۂ کعبہ میں ایک مصلّیٰ مذہب جعفری کا قائم ہو جائے نادر شاہ ایرانی سالہا سال تک سلاطین عثمانیہ کو لکھتا رہا۔ مگر سلطان محمود خاں اور ترکی کے شیخ الاسلام نے نہ مذہب جعفری کی صحت تسلیم کی نہ کعبے میں اس کا مصلّیٰ منظور کیا۔

خلاصہ

ہم نے قرآنی تعلیمات سے تفصیل کے ساتھ یہ بات واضح کردی ہے کہ اسلام کا اصل مقصود یہ ہے کہ جملہ بنی نوع انسان اکیلے اللہ کے بندے اور باہم بھائی بھائی ہوجائیں سب کے حقوق مساوی ہوں۔ کوئی کسی پر حکمراں نہ ہو اور سارا نظام قوانین الٰہی کے ماتحت ہو۔

حکومت الٰہی

آنحضرت ﷺ نے اپنے زمانے میں جس طریق پر اُمت کو چلایا اس کے متعلق کچھ لکھنا ہی غیرضروری ہے۔ وہ تو خالص پیغمبرانہ تعلیم اور مربیانہ تربیت تھی جو عالم کی تاریخ میں بے نظیر ہے۔ آپ کا ۲۳ سالہ عہد نبوت گویا ۲۳ موتیوں کی مالا ہے جو زمانے کی گردن میں پڑی ہوئی ہے۔ آپ کی صحبت کے فیض سے صحابۂ کرام نے خلافت کو انھیں اصول پر قائم کیا۔ خلیفہ میں شاہانہ تمکنت اور حکومت کی کوئی شان نہ تھی۔ عام لوگوں کی طرح وہ بھی سڑکوں پر پیدل پھرتا تھا۔ نہ اس کے ساتھ محافظ ہوتے تھے نہ نقیب۔ سب لوگ اس سے ملتے اور سب سے وہ ملتا۔ اس میں اور دوسرے مسلمانوں میں بجز عہدۂ خلافت کے کوئی امتیاز نہ تھا۔ نہ اس کو اس قسم کی دینی ریاست حاصل تھی کہ جو چاہے حکم دے دے۔ وہی مذہبی مسئلہ ہو جائے۔ بلکہ صرف احکام دینی کو نافذ کرنے کا مجاز تھا۔

اس خلافت کا کل زمانہ تیس سال رہا۔ اس تیس سال کے عرصے میں مسلمانوں کو وہ سربلندی نصیب ہوئی کہ ترکستان سے بحر خزر تک اور افریقہ میں تیونس تک اسلام پھیل گیا۔ اور قوت اس قدر زبردست ہوگئی کہ روئے زمین پر کسی کو ان سے

ٹکرانے کا یارانہ رہا۔ یہ تمام آسمانی برکتیں اور فتوحات اور امّت اسلامیہ کی یہ
یہ عظمت وشان اس وجہ سے تھی کہ سب اسلامی نظام میں منسلک اور اکیلے اللہ
کے بندے تھے خلیفہ کی ذات میں ان کی مرکزیت تھی جس کی وجہ سے ان کے ملی مقاصد
متعین تھے۔ اور ساری امّت ایک محور پر گھومتی تھی۔ وہ نہ صرف خود بھائی بھائی تھے
بلکہ ساری دنیا کی قوموں کے لیے انھوں نے حکومت الٰہی کا مامن اور ملجا تیار کر دیا تھا
کہ جو چاہے اس میں آکر ان کا بھائی بن جائے اور مساوی حقوق لے۔

عہد بنی امیّہ

خلافت راشدہ کے بعد بنی امیہ کا دور آیا جو ۲۵ ربیع الاول ۴۱ھ سے جس
دن امیر معاویہ کے ہاتھ پر خلافت کی عام بیعت ہوئی شروع ہوا۔ اس دور میں بھی جو
۹۲ سال رہا امت ایک ہی جھنڈے کے نیچے تھی۔ ان خلفاء کی ذات میں بھی امّت کی
سیاسی مرکزیت قائم رہی۔ اور خواہ وہ کیسے ہی رہے ہوں اسلامی قوت اور شوکت کو
انھوں نے سنبھالے رکھا بلکہ ولید بن عبدالملک کے عہد میں تو فتوحات کے حدود
مشرق میں سندھ اور چینی ترکستان تک اور مغرب میں اندلس تک پہنچ گئے تھے.
اور برّی فوجوں کے علاوہ ایک طاقتور بحری بیڑہ بھی تھا جس نے سطح آب پر کئی بار
رومیوں کو شکستیں دی تھیں۔ دولت کی فراوانی کا یہ حال تھا کہ ہر ایک اندھے اور
جذامی کو ایک ایک خادم دیا گیا تھا جس کے اخراجات بیت المال سے ملتے تھے
اور اہل نصاب راتوں کو اشرفیاں لے کر گھومتے تھے مگر کوئی لینے والا نہیں ملتا تھا۔

استبداد

مگر باوجود ان خوبیوں کے مرض پیدا ہو چکا تھا یعنی استبداد۔ وہ استبداد جو
اقوام امم کے لیے ہمیشہ مہلک ثابت ہوا ہے۔ اس کا پہلا مظہر خود ان کی خلافت
تھی۔ خلفاء راشدین میں سے اگرچہ ہر ایک کی نوعیت انتخاب جداگانہ تھی مگر شورہ

اور بیعت عامہ یعنی جمہوریت کی روح ہر ایک میں موجود تھی۔ لیکن امیر معاویہ جو خلافت بنی امیہ کے بانی ہیں۔ ان کا انتخاب عام نہیں ہوا تھا۔ صرف اہل شام نے ان کو خلیفہ بنایا تھا۔ اور اہل عراق نے حضرت علی کے بعد امام حسن کو منتخب کیا تھا۔ مگر جب امیر معاویہ نے ان پر لشکر کشی کی تو انھوں نے مصالحت کرلی۔ لہٰذا اہل عراق نے بھی امیر معاویہ کے ہاتھ پر بیعت کرلی مگر مغلوب ہو کر۔ اس وجہ سے ان کی خلافت میں تغلب شامل تھا۔ چنانچہ حضرت سعد بن وقاص فاتح قادسیہ جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں جب امیر معاویہ کے پاس آئے تو ان کو اس طرح سلام کیا جس طرح بادشاہوں کو کیا جاتا ہے۔ امیر معاویہ ہنسے اور کہا کہ تم مجھے امیر المومنین کہتے تو کیا بگڑ جاتا۔ انھوں نے جواب دیا کہ جس طریق سے تم نے خلافت حاصل کی ہے اگر مجھے ملتی تو میں کبھی اس کو قبول نہ کرتا۔

غرض اہل نظر اور ارباب تقویٰ خلافت کو اسی رنگ میں دیکھنا چاہتے تھے جو خلفاء راشدین کے عہد میں تھا۔ امیر معاویہ کا غلبہ اور تسلّط سے اس کو حاصل کرنا ان کو پسند نہ تھا۔ اگرچہ بعد میں یہ تغلب رضامندی سے بدل گیا کیونکہ امیر معاویہ کی خلافت کی قابلیت میں کسی شخص کو اختلاف نہ تھا۔ لیکن انھوں نے خلیفہ کے انتخاب عام کے دستور ہی کو توڑ ڈالا اور اپنے بعد اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد مقرر کیا جس کے بعد سے خلفاء بنی اُمیّہ سلسلے وار اپنے ہی خاندان کے افراد میں سے جس کو چاہتے ولیعہد بناتے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی خلافت پر استبداد غالب رہا۔ اور ان کی حکومت خاندانی سلطنت ہوگئی۔

قہر و غلبہ

بنی اُمیّہ کے عہد میں قہر و غلبہ کی حکمرانی تھی۔ یہاں تک کہ عبدالملک نے جو ان کا سب سے مدبّر خلیفہ تھا صاف صاف کہہ دیا کہ "تم لوگ کیونکر یہ خواہش رکھتے ہو کہ ہم شیخین کے طریقہ سے تمھارے اوپر حکومت کریں۔ پہلے خود تو دیسے بنو جیسے اس زمانے

کے لوگ تھے " اس وجہ سے ان کے زمانے میں وہ مظالم ہونے لگے جو استبداد میں لازمی ہیں۔ لوگ سختی کے ساتھ دبائے جانے لگے جس کی طرف سے مخالفت ہوتی اس کا سر کٹوا کر مشتہر کیا جاتا کہ دوسرے لوگ ڈر جائیں اور مخالفت کا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔

خلفاء کے علاوہ ان کے بعض بعض عمال نے بھی آزاد طبع اور حریت پسند مسلمانوں کو جنھوں نے خلافت راشدہ کا عہد دیکھا تھا نہایت سختی کے ساتھ محکوم اور رعایا بنانا شروع کیا۔ زیاد اور اس کے بیٹے کے مظالم مشہور ہیں۔ یہ صرف شبہ پر لوگوں کو گرفتار کر کے سخت سزائیں دیتے تھے۔ حجاج بن یوسف والی عراق جو بنی امیہ کا سب سے معتمد وزیر تھا اپنے ظلم و ستم میں خصوصیت کے ساتھ بدنام ہوا۔

چونکہ استبداد کی خاصیت یہ بھی ہے کہ اس کی حکومت رعایا کے فائدے کے لیے نہیں بلکہ حکمراں جماعت کے مقاصد کے لیے ہوتی ہے اس وجہ سے یہ خلفاء اپنے مخصوص اغراض کے لیے ملت میں وحدت بھی قائم رکھنا نہیں چاہتے تھے بلکہ اسلامی تعلیم کے خلاف ان میں جاہلانہ قبائلی عصبیتوں کو ابھار کر ایک کو دوسرے کا دشمن رکھتے تھے۔ تاکہ ضرورت پر ایک فریق سے دوسرے فریق کے مقابلے میں کام لے سکیں۔

بیت المال

سب سے بڑی بات یہ تھی کہ خلفاء راشدین عام افراد ملت کی طرح بسر کرتے تھے۔ بیت المال کو مسلمانوں کی ملکیت سمجھتے تھے اور اس میں سوائے اس کے جو ان کے گزارہ کے لیے مقرر کر دیا جائے۔ اپنی ذات کے واسطے ایک حبہ بھی نہیں لیتے تھے اس پر بھی کہا کرتے تھے کہ خلافت کی ذمہ داریوں سے قیامت کے دن اگر ہم بلا عذاب اور ثواب کے نکل گئے تو بہت بڑی کامیابی ہے لیکن خلفاء بنی امیہ شاہانہ شان و شوکت سے رہتے۔ بیت المال کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھتے اور جس طرح چاہتے اپنی منشاء کے مطابق صرف کرتے۔

ظاہر ہے کہ جس کا اقتدار خزانے پر ہوگا وہی ملک کے لوگوں پر اپنا اثر قائم کر سکتا ہے۔ یہ خلفاء مسلمانوں کے بیت المال کو اپنے استبدادی مقاصد میں صرف کر کے لوگوں کو اپنا تابعدار بناتے کیونکہ جو لوگ ان کے یہاں سے وظائف پاتے ان میں یہ جرأت باقی نہ رہتی کہ مخالفت کر سکیں۔ جو نافرمانی پر آمادہ ہوتا اس کا وظیفہ بند کر دیا جاتا چنانچہ یزید کے عہد میں اہل حرمین کے اور ولید کے زمانے میں آل حزم کے وظائف بند کیے گئے۔ انصار کے وظائف بارہا اس بنا پر روک دیے گئے کہ اہل بیت کی طرفداری کرتے ہیں۔

مدینے کا عامل زکوٰۃ کی رقم قریش کے سرداروں کو قرض دیا کرتا تھا جس کی وجہ سے ان پر قابو رکھتا تھا۔ جہاں ان سے کوئی مخالفانہ حرکت نمایاں ہوتی فوراً قرض کا مطالبہ شروع ہو جاتا۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ بنی امیہ کی اطاعت پر مجبور ہو گئے۔

ہوس زر

خلافت راشدہ میں ممالک مفتوحہ سے محاصل اس لیے وصول کیے جاتے تھے کہ مجاہدین کی ضروریات رفع کی جائیں اور فقراء و مساکین کی احتیاج کا سدباب کیا جائے لیکن بنی امیہ کا نصب العین چونکہ اپنے گھرانے میں مستقل سلطنت قائم کرنا تھا اس لیے ان کو ضرورت ہوئی کہ طاقتور قبائل و اشخاص پر اپنا اثر رکھیں۔ اس کی صورت سوائے اس کے اور کیا تھی کہ ان کو دولت سے اپنا طرفدار بنائیں۔ چنانچہ انھوں نے بیت المال کو اپنے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنایا اور جا و بیجا بے دریغ اس کی رقمیں صرف کرنے لگے۔ امراء و روٴسا، قبائل کے علاوہ خطباء و شعراء کو بھی بڑی بڑی رقمیں زبان بندی اور اپنی مدح و ثناء کے لیے دی جاتی تھیں۔ یہی وجہ ہوئی کہ محاصل کی وصولی میں ناجائز سختیاں عمل میں آنے لگیں۔ یہاں تک کہ بعض صوبوں کے ذمیوں سے مسلمان ہو جانے کے بعد بھی جزیہ وصول کیا جانے لگا افریقیہ اور خاص کر خراسان میں اس جھگڑے

نے بہت طول کھینچا۔ جب حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے تو اُنھوں نے یہ کہہ کر کہ ہم مبلّغ ہیں محصل نہیں ہیں اس خلاف اسلام طریقہ کو بند کیا۔ جس کے بعد لاکھوں ترک حدود سمرقند میں جو اسلام سے برگشتہ ہو گئے تھے پھر مسلمان ہو گئے۔

الغرض شخصی اور استبدادی حکومت کی جو لازمی خرابیاں ہیں وہ خلافت بنی امیہ میں پیدا ہو چکی تھیں۔ وہ اگرچہ مسلمانوں کا مرکز تھے لیکن ان کی مرکزیت خلفاء راشدین کی طرح اخوت، مساوات اور جمہوریت کی مرکزیت نہ تھی بلکہ انھوں نے ملّت کو جو خلافت راشدہ میں صرف اللہ کی غلام تھی اپنا غلام بنالیا تھا۔

بنی عباس

عباسیہ جنھوں نے مخفی تبلیغوں سے بنی امیہ کی بغاوت کا بیج بویا اور پھر ان کے مقابلے کے لیے لوگوں کو کھڑا کیا جب کامیاب ہو کر ۱۳۲ھ میں تخت خلافت پر آگئے تو انھوں نے بھی وہی استبداد قائم رکھا جو بنی امیہ کے عہد میں تھا۔ ان میں سے ابتدائی آٹھ خلفاء کا زمانہ جو تقریباً سو سال رہا قوت اور شوکت کا زمانہ تھا۔ انھوں نے شعائر اسلامی کا احترام رکھا۔ نمازیں بھی پڑھتے تھے۔ حج بھی کرتے تھے اور جہاد میں بھی حصّہ لیتے تھے مگر باوجود اس کے ملک و ملّت کو ہمیشہ کے لیے اپنا اور اپنی اولاد کا غلام رکھنا چاہتے تھے۔ ایک کے بجائے دو دو تین تین ولی عہد مقرر کرتے تھے اور ان عہد ناموں پر اللہ اور رسول۔ ملائکہ جنّات تک کو گواہ بناتے تھے تاکہ یہ "جائداد" کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہ جاسکے اور ابد تک ساری ملّت اسلامیہ انھیں کے استبداد کے شکنجہ میں رہے۔

خلفاء بنی امیہ کو توجملہ امّت کی مرکزیت سیاسی بھی حاصل تھی مگر بنی عباس کے قبضہ سے اندلس روز اول سے خارج رہا۔ جہاں بنی امیہ کے بقایا میں سے ایک شخص عبدالرحمٰن بن معاویہ نے پہنچ کر سلطنت قائم کر لی تھی جو تھوڑے ہی دنوں کے بعد عظمت و

شان کے لحاظ سے خلافت عباسیہ کی حریف ہوگئی۔ علاوہ بریں عہد بنی امیہ میں قوت کی حکمرانی تھی کیونکہ ان کی سلطنت اپنی قوم عربوں کی عصبیت اور طاقت پر قائم تھی مگر بنی عباس نے عجمیوں خاص کر خراسانیوں کی مدد سے سلطنت حاصل کی تھی۔ اس وجہ سے کوئی قومی طاقت ان کے پاس نہ تھی۔ ان کی خلافت بجز اس کے کہ خلیفہ عرب تھا اور زبان عربی تھی سرتاسر عجمی تھی۔ اور ساری وزارتیں اور امارتیں عجمی موالیوں کے ہاتھوں میں تھیں یہی وجہ ہوئی کہ ان کو یہ خطرہ ہوا کہ کہیں یہ خلافت کو ہمارے ہاتھوں سے نکال کر دوسروں کو نہ دے دیں۔ چنانچہ انھوں نے ایرانیوں کی طاقت کے بالمقابل ترکوں کی بھی ایک فوج رکھی تاکہ توازن قائم رکھیں۔ مگر اس ترکی فوج نے خود خلفار پر تغلب حاصل کر لیا جس کو چاہتے تھے خلیفہ بناتے تھے اور جس کو چاہتے تھے معزول بلکہ قتل کر دیتے تھے۔ خلفار کی اس بے بسی کے زمانے میں سارے انتظامات درہم برہم ہو گئے اور نئی نئی سلطنتیں ظہور پذیر ہونے لگیں۔ جن کے غلبہ سے بے دست دپا ہو گئے۔ دیالمہ اور سلاجقہ کے تسلّط کے عہد میں جو صدیوں رہا ان خلفار کا صرف مذہبی اثر رہ گیا تھا اور حکومت سلاطین کے ہاتھوں میں تھی۔

خلافت کا مقصد یہ تھا کہ جملہ بنی نوع انسان صرف حکومت الٰہی کے فرمانبردار ہوں نہ کہ انسانوں کے۔ لیکن اموی اور عباسی خلفار نے اس کو محض خاندانی سلطنت بنانے کی کوشش کی جس کا انجام وہی ہوا جو ہر ایسے دنیادی کاموں کا ہوا کرتا ہے۔ امرار ولایات نے جب خلفار کی یہ خودغرضی دیکھی تو ان میں بھی اسی قسم کی خواہش پیدا ہوئی اور وہ یکے بعد دیگرے خودمختار ہوتے گئے۔ خلفار کا صرف رسماً اس قدر اثر رہ گیا تھا کہ یہ متغلبین تحفے اور ہدیے بھیج کر ان سے اپنی اپنی حکومتوں کی سند لکھوا لیتے۔ آخر ۶۵۶ھ میں یہ بے جان خلافت ہلاکو کے ہاتھوں غارت ہو گئی۔

خلفاء عثمانیہ

بغداد کی تباہی کے بعد سلاطین مصر نے انھیں بقایائے بنی عباس میں سے ایک شخص کو مصر میں خلیفہ بنا لیا تاکہ اس ذریعہ سے اپنی حکومت کو مستحکم رکھیں۔ ان خلفاء کا عزل و نصب خود سلاطین مصر کے اختیار میں تھا جن کے وظیفہ پر یہ گزر کرتے تھے۔ سنہ ۹۲۳ھ میں سلطان سلیم عثمانی نے مصر کو فتح کر کے خلافت بھی حاصل کر لی۔ اور اس طرح اپنے دنیاوی دقار کے دستار میں دینی عزّت کا بھی طرّہ لگایا لیکن خلفاء عثمانیہ بالطبع اپنے رتبہ سلطنت ہی کو جس کے ذریعے سے انھوں نے خلافت حاصل کی تھی بالاتر سمجھتے رہے۔ اور سوائے سلطان کے کبھی اپنے آپ کو خلیفہ کہلانا پسند نہ کیا۔ انھوں نے شروع سے آخر تک بجز حرمین شریفین کے خادم اور جزیرۃ العرب کے محافظ ہونے کے جو فتح مصر کے بعد سے ان کی سلطنت کا جزو ہو گیا تھا فرائض خلافت کا خیال نہ رکھا۔ یہاں تک کہ حج جس میں اقصائے عالم کے مسلمان آکر شریک ہوتے ہیں اور جو اجتماع ملّت کا دینی مرکز ہے اس میں بھی وہ کبھی نہیں آئے۔ بالآخر ۱۳۴۲ھ میں جمہوریہ ترکیہ نے اس خلافت کا بھی جو اتحاد ملّت کا ایک بوسیدہ رشتہ اور بے معنی ادارہ رہ گیا تھا الغا کر دیا۔ جس کے بعد سے مسلمانوں کی مرکزی زندگی کا نام بھی جاتا رہا۔

موجودہ حالت

آج امت اسلامیہ کی تعداد تمام عالم میں تخمیناً ساٹھ کروڑ بتائی جاتی ہے جو دنیا کی بڑی سے بڑی قوموں کی تعداد سے اگر زیادہ نہیں ہے تو کم بھی نہیں ہے۔ مگر ان میں سے سوائے ترک۔ ایرانی۔ افغان اور عرب کے جن کی مجموعی تعداد چھ کروڑ سے زیادہ نہیں ہے بقیہ ساری امت غیر مسلم حکومتوں کے قبضہ میں ہے یعنی مسلمانوں کی مجموعی تعداد کا زیادہ سے زیادہ صرف دسواں حصہ ہے جو آزاد کہا جا سکتا ہے۔ ان آزاد اقوام مسلمہ کا بھی کوئی ایک مرکز نہیں ہے بلکہ متعدد خود مختار سلطنتوں

میں بٹی ہوئی ہیں۔ عرب جس سے اسلام کا چشمہ ابلا تھا آج اس میں چھوٹی بڑی نو ریاستیں ہیں۔ یہ تشتت نتیجہ ہے امرا و سلاطین امّت کی ان مطلق العنانیوں کا جن کی وجہ سے انھوں نے مرکزیت کا لحاظ نہیں رکھا اور اپنے ذاتی اغراض کے پیچھے ملّت کے انجام پر نظر نہیں ڈالی ۔

جو قومیں غیروں کی محکوم ہیں ان کا انتشار تو اس درجہ پر پہنچ گیا ہے کہ ان کے اعمال سے صلاحیت مفقود ہوگئی ہے۔ ادھر کم سے کم دو سو سال کے کارناموں پر اگر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ باوجود کوششوں اور قربانیوں کے بھی کامیابیوں کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہو سکا۔ مراقش سے لے کر دیوار چین تک کتنے ہنگامے اٹھے اور مجاہدانہ معرکے ہوئے۔ مگر ہر ایک میں نقصان ہی اٹھانا پڑا۔ وجہ صرف یہ ہے کہ امّت کا شیرازہ بکھرا ہوا ہے اور کوئی مرکز نہیں ہے جو اس کی قیادت کرے ۔

قرآن کا وعدہ حق ہے کہ عزّت مومنوں کے لیے ہے ۔

وَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ وَلِرَسُولِہٖ وَلِلْمُؤْمِنِینَ ۶۳	عزت اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کے لیے ہے ۔

قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ مومنوں کی مدد اللہ کے ذمہ ہے اور وہی سربلند رہیں گے ۔

وکان حقاً علینا نصر المومنین ۴۷/۳۰	اور ہمارے اوپر حق ہے مومنوں کی مدد کا ۔
ولاتہنوا ولاتحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین ۱۳۹/۳	اور نہ سست ہو اور نہ غم کرو۔ اگر تم مومن ہو تو تم ہی سربلند رہو گے ۔

قرآن یہ بھی اطمینان دلاتا ہے کہ کفار کو مومنوں پر کبھی غلبہ نہ ہوگا ۔

ولن یجعل اللہ للکافرین علی المومنین سبیلا ۱۴۱/۴	اور اللہ کافروں کو کبھی مسلمانوں کے اوپر راستہ نہ دے گا ۔

قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ مومن کفار پر ہمیشہ غالب رہیں گے ۔

ولو قاتلکم الذین کفروا لولوا الادبار ثم لایجدون ولیاً ولا نصیرا ۲۲/۴۸	اور جو کفار تم سے لڑیں گے تو پیٹھ پھیر لیں گے اور وہ کوئی پشت پناہ اور مددگار نہیں پائیں گے ۔

اور قرآن مومنوں کے لیے روئے زمین کی بادشاہت کا بھی وعدہ کرتا ہے۔

وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض ۵۵/۲۴	تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کرتے رہے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو ضرور روئے زمین میں بادشاہ بنائے گا۔

لیکن ان کے برخلاف صدیوں سے مسلمان مسلسل زوال اور انحطاط کے گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں جو سرعت کے ساتھ ان کو ہلاکت اور تباہی کی طرف لیے جا رہا ہے۔ وہ نہ صرف زندگی کی دوڑ میں اقوام عالم سے پیچھے رہ گئے ہیں بلکہ ان کا بڑا حصہ کفر و شرک سے مغلوب ہو کر محکومیت کے دردناک عذاب میں گرفتار ہے۔ جس سے رہائی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

ہمارا ایمان ہے کہ قرآن کریم کے وعدے غلط نہیں ہو سکتے۔ اور ممکن نہ تھا کہ ہمارے مومن ہوتے ہوئے اللہ اپنے وعدے پورے نہ کرتا۔ اس لیے ہم کو یقین کرنا پڑتا ہے کہ ہمارا مومن اور صالح العمل ہونا اللہ کے نزدیک مسلّم نہیں ہے جس کی وجہ سے ہم ان وعدوں کے مستحق نہ رہ سکے۔

ذہنی تشتت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے صرف ایک کتاب لے کر آئے تھے یعنی قرآن کریم جس پر عمل کر کے صحابہ کرام نے دینی اور دنیاوی سربلندی حاصل کی۔ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم نے اپنا عمل اسی کتاب پر رکھا اور امّت کو اس سے ہٹنے نہ دیا جس کی وجہ سے ان کے زمانوں میں کوئی مذہبی تفرقہ پیدا نہ ہو سکی اور ساری امّت متحد رہی۔

عہد بنی امیہ میں جب استبداد کا تسلّط ہوا اس وقت خلفاء نے دنیا کو لے کر دینی قیادت چھوڑ دی جو علماء کے حصہ میں آ گئی۔ اسی وقت سے اختلافات پڑنے

لگے اور شخصیت پرستی کی وجہ سے نت نئے فرقے بننے شروع ہو گئے۔ عباسی عہد میں فقہا میں اختلافات واقع ہوئے جن کی وجہ سے رفتہ رفتہ ان کے پیروؤں کی ٹولیاں الگ الگ ہونے لگیں اسی زمانے میں علوم عقلیہ کے عربی میں ترجمے ہوئے۔ اس وقت سے اختلافات روایات و تاویلات کے باعث یہ ذہنی کشمکش اور بڑھ گیا۔ چنانچہ ایک ہی ملت میں ۷۳ فرقے بن گئے جن میں سے ہر ایک اپنے ہی کو ناجی سمجھنے لگا اور دوسروں کو ناری۔ اس طرح پر ملّت کی وحدت پارہ پارہ ہو گئی۔ اور ہر مسلمان صرف انفرادی حیثیت سے مسلمان رہ گیا نہ کہ اجتماعی۔

خاتم النبیّین صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے امّت کو دو عظیم الشان نعمتیں ملی تھیں۔ ایک قرآن کریم۔ دوسری امارت کبریٰ یعنی مرکزیت امت جس کو آپ نے منصب فرمایا تھا۔ استبداد نے مرکزیت کو فنا کر دیا اور سیاسی لحاظ سے امت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور اشخاص پرستی نے قرآن کو متروک کر دیا۔ اور مذہبی لحاظ سے اُمت کے کئی فرقے بنا دیئے جس سے دنیاوی اور دینی دونوں حیثیت سے اس میں لامرکزیت آ گئی۔ اس لیے امت کی آئندہ صلاح و فلاح کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ لامرکزیت کو چھوڑ کر وحدت کی طرف آئے۔ یعنی رفتہ رفتہ مسلمانوں کا مرکز ایک ہو جائے۔ جہاں سے ملت کے اجتماعی مقاصد کی تعیین اور ان کو عمل میں لانے کی تشکیل ہو اور دینی مرکز صرف قرآن ہو۔ تاکہ ہر قسم کی فرقہ بندی مٹ جائے اور سب کے سب متحد ہو کر ایک راستے پر گامزن ہوں۔

خاتمہ

قرآن کریم میں ہر صاحب بصیرت غور کرنے سے اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ اسلام مجموعی لحاظ سے اجتماعی دین ہے۔ یعنی وہ جملہ نوع بشر کی اجتماعی زندگی کا ایک مکمل نظام ہے۔ بے شک وہ انفرادی تعلیمات بھی پوری پوری اپنے اندر رکھتا ہے لیکن ان تعلیمات سے وہ افراد کا تزکیہ باطن اور ان میں تقویٰ پیدا کر کے ان کو ملت کا جزو صالح بنانا چاہتا ہے تاکہ پوری ملت کی اجتماعی زندگی صالح العمل ہو جائے۔ یہ نظام اللہ کا مقرر کیا ہوا ہے۔ اس کے خلاف جو نظام بھی قائم ہوگا وہ غیر اسلامی اور اللہ کی مرضی کے خلاف ہوگا۔ یہ پانچ ارکان کی ادائگی پر قائم ہے جن سے انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیوں کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ یعنی توحید۔ نماز۔ زکوٰۃ۔ روزہ اور حج۔

یہ آخری رکن جو اسلام کے مرکزی مقام مکہ میں ادا کیا جاتا ہے امت کی اجتماعی خرابیوں کی اصلاح کے لیے ہے اور اسی کے ذریعہ سے ہم آج بھی اپنی بگڑی کو سنوار سکتے ہیں اگر خلوص دل سے کوشش کریں۔ اس لیے اس کی کیفیت کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھتا ہوں[1]۔

بیت اللہ توحید پرستوں کی پہلی مسجد ہے جس کے معمار حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے جو موحدوں کے پیشوائے اعظم ہیں۔ انھوں نے بحکم الٰہی اس گھر کو اکیلے اللہ کی عبادت کے لیے بنایا۔ اس وقت جب کہ دنیا میں کوئی دوسری مسجد نہ تھی

ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکاً وہدی للعالمین ۳/۹۶	پہلا (توحید کا) گھر جو انسانوں کے لیے بنایا گیا وہ ہے جو مکہ میں ہے۔ برکت والا اور دنیا جہاں کے لیے ہدایت۔

---

[1] حج کی حقیقت پر ہمارا مبسوط مقالہ طلوع اسلام دہلی دسمبر ۱۹۳۹ء میں شائع ہو چکا ہے۔

جب گھر بن گیا تو اللہ نے حضرت ابراہیم کو حکم دیا کہ لوگوں میں اعلان کر دو کہ یہاں حج کے لیے آیا کریں۔

وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ ۲۲/۲۷ | اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دے

یہ اعلان کل انسانوں کے لیے کیا گیا جیسا کہ فی الناس کے لفظ سے ظاہر ہے لیکن مراد یہاں بنی نوع انسان کے موحدین ہیں۔ کیونکہ اس گھر کی بنیاد ہی توحید پر ہے۔ اور قرآن نے اس میں غیر موحدوں کا داخلہ بند کر دیا ہے۔

اِنَّمَا الْمُشْرِکُوْنَ نَجَسٌ فَلَا یَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ ۹/۲۸ | مشرک تو نجس ہیں۔ وہ مسجد حرام کے پاس بھی نہ پھٹکیں۔

یہاں ضمناً یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ اسلام نے کہ روز ازل سے وہی دین الٰہی ہے۔ جملہ انسانوں کو یکساں قرار دیا ہے اور نسل، رنگ، ملک یا زبان کے اختلاف سے ان میں کوئی تفریق نہیں کی ہے۔ صرف ایک تفریق کو وہ ضروری قرار دیتا ہے۔ یعنی اسلام و کفر کی۔ جو لوگ عہد الست پر قائم ہیں اور انبیاء کے ذریعے سے ملی ہوئی صحیح تعلیم کے تابع۔ وہ حزب اللہ ہیں اور جو شرک یا کفر میں مبتلا ہیں حزب الشیطان ہیں۔ یہ تفریق بلا امتیاز قوم و نسل قائم رہی ہے اور قیامت بلکہ جنت اور دوزخ تک رہے گی۔

الغرض کعبہ کو اللہ نے موحدوں کا بین الاقوامی مرکز قرار دیا۔ اور خاتم النبیین کے عہد میں اس مرکزیت کو مستحکم کرنے کے لیے ملت اسلامیہ کا قبلۂ نماز بھی اسی کو بنایا۔

آج حضرت ابراہیم کے اعلان کو کم و بیش چار ہزار سال ہو گئے، حج کا سلسلہ برابر جاری ہے اور ہر سال اس مرکز میں دنیا کے چاروں گوشوں سے موحد آ کر جمع ہوتے ہیں۔ اللہ نے نہ صرف اس مکان کو بلکہ اس زمان کو بھی مرکزی حیثیت کے لحاظ سے احترام بخشا جس میں یہ اجتماع ہوتا ہے۔

جعل اللہ الکعبۃ البیت الحرام قیاماً للناس والشہر الحرام ۹۷/۵	اللہ نے کعبہ بیت الحرام کو انسانوں کے لیے دارومدار قرار دیا نیز ماہ حرام کو۔

اس آیت میں تصریح کی گئی ہے کہ کعبہ موحدوں کی بین الاقوامی انجمن کا مرکز ہے جہاں سے اجتماعی امور کی اصلاح عمل میں آئے گی۔ اور جس زمانے میں یہ اجتماع ہوتا ہے اس زمانہ یعنی ذی قعدہ۔ ذی الحجہ اور محرم تینوں مہینوں کو محترم قرار دیا جس میں ہر قسم کے جھگڑے روک دیے جائیں گے تاکہ لوگ امن کے ساتھ اس میں شریک ہوسکیں۔

اس اجتماع کی غرض بھی صرف ایک مختصر جملہ میں بیان کر دی۔

لیشہدوا منافع لہم ۲۸/۲۲	تاکہ اپنے فائدے کے لیے حاضر ہوں۔

یہ فائدے کچھ اخروی ثواب ہی تک محدود نہیں ہیں بلکہ دینی۔ دنیاوی۔ ملکی اور ملّی وغیرہ ہر قسم کے فائدے اس میں داخل ہیں۔ اور یہی رکن ہے جس سے ملت کی ہر قسم خرابیوں کی اصلاح ہوسکتی ہے۔

یہی مرکزیت باعث ہوئی کہ قرآن نے مسجد الحرام کے بین الاقوامی ہونے کا اعلان کیا۔

سواءن العاکف فیہ والباد ۲۵/۲۲	اس میں باشندے اور باہر والے یکساں ہیں

جس کی وجہ سے صحابہ کرام کی قرآنی بصیرت رکھنے والی جماعت نے جس میں حضرت عمر اور عبداللہ بن عباس وغیرہ شامل ہیں پورے شہر مکہ کو بین الاقوامی قرار دیا اور وہاں کے کسی باشندے کا یہ حق نہیں تسلیم کیا کہ وہ کسی آفاقی اور باہر سے آنے والے حاجی کو اپنے گھر میں قیام سے روک سکے۔ بلکہ وہ مکہ کے گھروں میں کواڑ لگانے کو بھی منع کرتے تھے۔ اور اگر کتوں وغیرہ سے تکلیف کا خیال نہ ہوتا تو اس کی اجازت بھی نہ دیتے

حج کی صحیح صورت یہ ہے کہ جس جس ملک یا قوم کے مسلمان مکہ میں آئیں پہلے سے اپنا اپنا ایک ایک امیر حج منتخب کرلیں۔ یہ امراء حج نہ صرف یہ کہ اپنے ملک یا اپنی قوم کے حاجیوں کے قیام وطعام کا مکہ میں بندوبست کریں بلکہ ان کے نمائندے اور

ترجمان بھی ہوں۔ پھر یہ سب کے سب امراء مکہ میں باہم مل کر بیٹھیں۔ تبادلۂ خیالات کریں تاکہ ہر اسلامی ملک اور قوم کی دینی اور دنیاوی حالت اجتماعی لحاظ سے ان کے سامنے آجائے۔ انھیں امراء میں سے ایک منتخب دماغ عرفات کے مجمع عام میں ایک خطبہ دے۔ جس میں ملّت کی پوری اجتماعی حالت پر تبصرہ اور ان کی رہبری ہو اور ایک سال کا اجتماعی لائحۂ عمل۔

عرفات سے پلٹ کر حجاج مقام منا میں آجاتے ہیں۔ یہاں تین دن ٹھہرتے ہیں۔ قربانیاں کرتے ہیں اور کھاتے اور کھلاتے ہیں۔ یہاں بھی تنظیم کی ضرورت ہے۔ ہر قوم کے افراد اپنی قربانی کی رقمیں اپنے امراء کو دیدیں۔ وہ ضرورت اور اندازے کے مطابق قربانیاں کرے۔ ایک جگہ پکوائے اور سب کو ایک ساتھ مل کر کھائیں۔ اقوام مسلمہ جن کا داخلی تعارف امراء کے ذریعے سے مکہ میں ہو چکا ہے یہاں ایک دوسرے کی میزبانی اور مہمانی کر کے آپس میں تعارف پیدا کریں تاکہ باہمی اور الفت اور اخوت سے وحدت ملّی کا احساس بڑھے۔

تشریق کے ان تین دنوں میں ہر جماعت کے امیر کو عرفات کا خطبہ اپنے ہمراہیوں کو اپنی زبان میں سمجھا دینا چاہیئے۔ اب جو حاجی وہاں سے پلٹ کر اپنی بستی میں آئے گا۔ وہ عرفات کے منبر کا پیغام ساتھ لائے گا۔ اس سے تمام عالم اسلامی میں اجتماعی روح بیدار ہو جائے گی۔

ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے منبروں کو ہدایت کے لیے نصب فرمایا ہے۔ ان کا رشتہ قلوب کے ساتھ ہے کیونکہ ان سے جو آوازیں نکلتی ہیں وہ دلوں تک نفوذ کرتی ہیں۔ یہ بمنزلہ برقی بیٹری کے ہیں جن سے دلوں کے قمقموں میں روشنی اور حرارت پہنچتی ہے۔ ان سب منبروں کا مخزن میدان عرفات کا منبر ہے جو افسوس ہے کہ مدتہائے دراز سے خاموش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُمت کے قلوب بے نور، افسردہ اور منتشر ہیں۔

تنظیم کی صورت صرف نصب مرکزیت ہے اور کچھ نہیں کیونکہ مرکز کی طرف ہر فرد خودبخود متوجہ ہو جاتا ہے جس سے ساری قوم منظم ہو جاتی ہے جیسے شمع کہ اس کے روشن ہوتے ہی گھر کی کل چیزیں اپنی اپنی جگہ پر نظر آنے لگتی ہیں۔ افراد یا جماعتوں۔ یا دیہات یا مسجدوں سے جو لوگ اُمّت کی تنظیم کرنا چاہتے ہیں ان کو ہمیشہ ناکامی ہوگی اس لیے کہ یہ اُلٹا راستہ ہے۔

اس طرح پر ہم اپنے حج کے بین الاقوامی اجتماع سے کام لے کر ہر اسلامی خطہ کی آزادی کی کوشش کر سکتے ہیں یہ ممکن ہے کہ انقلابات جو عجلت کے ساتھ اقوام و ملل پر آ رہے ہیں ان میں ایسا وقت آ جائے کہ مسلمان جن خطوں میں آباد ہیں ان میں آزاد جمہوریتیں قائم ہو جائیں۔ پھر ہماری یہی مکہ کی بین الاقوامی انجمن ملّت کا مرکز بن جائے گی۔

اب میں اپنی ایک نظم پر جو عرصہ ہوا طلوع اسلام میں شائع ہوئی تھی اس کتاب کو ختم کرتا ہوں۔

عروج پا نہیں سکتی جہاں میں وہ ملّت — کہ جس کا کوئی نہ مرکز ہو اور نہ کوئی نظام
ہو گرچہ ریگِ بیاباں کی طرح لاتعداد — ہوا کے جھونکوں میں اُڑتی پھرے گی صبح اور شام
اگر ہو نظم تو ملّت ہے آہنی دیوار — کہ جس کے سامنے طوفاں کو بھی نہیں ہے قیام
یہ نظم کیا ہے فقط ایک نقطۂ مرکز — زبانِ شرع میں جس کو کہا گیا ہے امام
ہیں اجتماعی مقاصد اُسی سے وابستہ — امامِ زندہ ہے ملّت کی زندگی کا قوام

جہان کی دوسری قوموں کا ہے نسب پہ مدار — مگر ہے ملّتِ اسلام جامع الاقوام
اساس اس کی ہے بس "لا الٰہ الا اللہ" — اسی اساس پہ قائم ہوئی اخوت عام
نہ کوئی نسل، نہ کوئی زبان، نہ کوئی ملک — ہے امتیازِ سیاہ و سفید و سُرخ حرام
ہے اس کے ربط میں قوموں کا ارتباط بہم — ہے اس کے نظم میں دنیا کی اُمتوں کا نظام

یہ کیا غضب ہے کہ مسلم کو یہ نہیں معلوم
سپرد کی گئی اس کو امامتِ اقوام

امام ملّتِ اسلام نائب حق ہے
تمام اہل جہاں جس کے حکم کے ہیں غلام

اگر ہے دین محمدؐ کا پاس ملّت کو
تو آج نصب امامت ہے اس کا پہلا کام

اسی قبیل کی اپنی ایک دوسری نظم بھی شائع کرائی تھی۔ یہاں اس کو بھی درج کرتا ہوں۔

انفرادیت ہے اقوام وامم کے حق میں موت
اس کے سایہ سے بھی ہے اقبال کتراتا ہوا

آہ! وہ ملّت کہ جو رکھتی نہیں زندہ امام
دم بدم دیکھے گا تو اس پر زوال آتا ہوا

وہ سمجھتی ہے جسے جنّت کی راہ مستقیم
راستہ جاتا ہے وہ دوزخ کو بل کھاتا ہوا

دین و دنیا کچھ نہیں ملتا ہے مرکز کے بغیر
بے سری ملت پہ ہے ادبار منڈلاتا ہوا

اجتماعیت کے اوپر ہے بنا اسلام کی
دیکھتا ہوں میں ادھر مسلم کو بھر آتا ہوا

اس رواقِ نیلگوں میں مجھ کو آتا ہے نظر
اپنی ملّت کا ستارہ نور برساتا ہوا
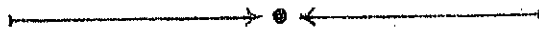
تصانیف مولانا محمد اسلم جیراجپوری

تاریخ الامت:۔ ابتدائے اسلام کی مکمل، مستند اور مربوط تاریخ جو نہایت تحقیق کے ساتھ سلیس اور صاف زبان میں لکھی گئی اور بوجہ اپنی خوبیوں کے جگہ جگہ نصاب میں داخل اور ملک میں مقبول ہو چکی ہے۔

- **حصہ اوّل:۔** سیرۃ الرسول عـہ/۸
- 〃 **دوم:۔** خلافتِ راشدہ ... ... سے/
- 〃 **سوم:۔** خلافتِ بنی اُمیّہ ... ... عـہ/
- 〃 **چہارم:۔** خلافتِ عبّاسیہ ... ... ۱۴/ سے
- 〃 **پنجم:۔** عبّاسیہ بغداد ... ... ۲/ سے
- 〃 **ششم:۔** عبّاسیہ مصر ... ... ۱۴/ سے
- 〃 **ہفتم:۔** آلِ عثمان ... ... عـہ
- 〃 **ہشتم:۔** تاریخ اسلام اور قرآن ... ... ۲۵/ سے

نکاتِ قرآن:۔ قرآن کریم کے سیکڑوں نکتے بطور سوال و جواب لکھے گئے ہیں۔ سوالات قرآن سے لیے گئے، اور جوابات بھی قرآن سے دیے گئے ہیں ... ... عـہ/

خواتین:۔ ۳۳ مشہور اسلامی خواتین کی سوانح عمریاں اور ان کے مستند تاریخی حالات درج ہیں ... ... للعہ/

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر دہلی